بِسۡمِ ا للّٰهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِيۡم

اکتوبر آٹھ

جاوید مغل تیموری

موغالز پبلی کیشنز

لاہور☆نیویارک☆لندن

جملہ حقوق بحق پبلشر محفوظ ہیں

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ موغالز پبلی کیشنز یا مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع یا پکچرائز نہیں ہوسکتا۔ اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

عنوان: اکتوبر آٹھ

مصنف: جاوید مغل تیموری

اشاعت: اوّل

سال: جون 2007

تعداد: 1000

Mu Ghaalz Publications

79 Ferozpur Road Ichhra, Lahore (Pakistan)

Phone: 7589173

E.mail: mughaalz@yahoo.com

رسید زرِ تعاون

نظامِ شمسی میں سے کشش ختم کر دی جائے تو کل کائنات فنا ہو جائے گی۔ ایک موہ کا بندھن ہی ہے جو سدرۃ المنتہیٰ سے آگے قوتِ رسائی مہیا کرتا ہے۔ اس کائنات کی بنیاد جس جوہر پر قائم ہے، وہ ہے محبت۔ اس کے کئی روپ ہیں۔ تمام انسانیت ایک ناقابلِ تقسیم وجود ہے، کوئی ایک عضو درد میں مبتلا ہو تو باقی وجود چین سے سو نہیں سکتا۔

یہ کتاب صرف اور صرف آٹھ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے متاثرینِ زلزلہ کے درد بانٹنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس کا تمام تر زرِ تعاون خطہء متاثرین کی بہبود و بحالی کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ بصورتِ دیگر کوئی مالی منفعت ادارے یا مصنف کے پیشِ نظر نہیں ہے ۔

آپ کے ہاتھوں میں یہ کتاب رسید ہے اُس تعاون کی، جو آپ نے یا آپ کے دوست نے یا پھر آپ کے کسی رشتے دار نے اس ادارے اور مصنف کے ساتھ شیئر کیا۔

جس کے لئے ہم آپ کے تہ دل سے مشکور ہیں۔ اور خالقِ حقیقی سے آپ کے اس عملِ صالح کے اجر کے لئے دعا گو ہیں۔

نوازش

ادارہ

موغالز پبلی کیشنز

ابّا جی
غلام نبی مغل
کے
نام
جو اس دنیا میں موجود نہیں
مگر
میرے آس پاس ہی رہتے ہیں

ترتیب

1- دُھندلکے ---------- 17
2- تعاقب ---------- 39
3- بساطِ دہر ---------- 65
4- مسافت ---------- 87
5- لائیوتھرلر ---------- 99
6- کیسا حرفِ وفا ---------- 109
7- سرپرائز ---------- 129
8- اکتوبر آٹھ ---------- 145
9- شیرزمان ---------- 163
10- تکمیل ---------- 181
11- اسقاط ---------- 197
12- آؤزندگی بچائیں ---------- 217
13- زلزلہ.....آدم تاایں دم ---------- 231

آغازِ کلام

انسانوں پر تباہی کیوں آتی ہے؟ اس کے ممکنہ اسباب کیا ہو سکتے ہیں؟اس موضوع پر سائنسدان اور فلاسفر اپنے اپنے مطالعہ اور تحقیق کی روشنی میں کچھ نہ کچھ کہتے ہی رہتے ہیں۔

آٹھ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے دن پاکستان میں اس صدی کا سب سے بدترین زلزلہ آیا جس سے اتنی تباہی ہوئی کہ گاؤں کے گاؤں صفحہء ہستی سے مٹ گئے۔سب کچھ ملیہ میٹ ہو گیا۔ تباہی کا درست اندازہ ابھی تک نہیں لگایا جا سکا۔ ہر دردمند دل نے اُن کیلئے تڑپ محسوس کی جو اُس تباہی کا شکار ہوئے اور اپنی اپنی بساط کے مطابق اُن کیلئے کچھ نہ کچھ کیا اور تا حال کر رہے ہیں۔

اُن علاقوں میں جہاں انسان کی بلند ظرفی کا مظاہرہ ہو رہا ہے، وہیں انسان کی بے حسی بھی دیکھنے کو مل رہی ہے۔

قدرتی آفات سے جہاں تباہی آتی ہے وہاں کچھ واقعات کا ظہور بھی ہوتا ہے، اُنہی واقعات کا تسلسل ،میڈیا اور دوست احباب کے ذریعے مجھ تک پہنچتا رہا۔ جسے میں نے پورے خلوص کے ساتھ کہانیوں کی شکل دینے کی سعی کی ہے۔اس ساری کوشش کا اصل مقصد اُن لوگوں کے غم میں برابر کا شریک ہونا ہی ہے جو اس تباہی و بربادی کا نشانہ بنے اور شکار ہوئے۔

جو لوگ ہم سے بچھڑ گئے ،اللہ اُن کی مغفرت کرے اور جو زندہ بچ گئے ہیں، میں اُن کے بہتر مستقبل کیلئے دعا گو ہوں۔

جاوید مغل تیموری

اظہارِ تشکر

کسی بھی کتاب کے پیچھے اُس ہاتھ کے علاوہ کہ جس کا نام کتاب کے سرورق پر چھپا ہو، بہت ہاتھ ہوتے ہیں۔ اُن ہاتھوں کا شکریہ ادا کرنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔

اس کتاب ''اکتوبر آٹھ'' کا بنیادی تصور میری شریکِ حیات امبر (ایمبر تیموری) کا ہے، جس کیلئے میں اُس کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ ایمبر نے اس کتاب کے ورق ورق پر نہ چاہتے ہوئے بھی میری رہنمائی کی۔

شمع جبیں جو کہ حلقہء خواتین کی لکھاڑی ہیں، کا میں بہت مشکور ہوں، جنھوں نے ان کہانیوں کو بہتر بنانے کیلئے میرے ساتھ کافی مغززنی کی۔

میں حامد مشہود کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنہوں نے اس کتاب کی صحتِ زبان میں میری مدد کی۔

منان ارشد مغل (مانی) کا شکریہ کہ جس نے اس کتاب کو کمپوز کیا اور بار بار کیا۔

اور آخر میں جناب نعمان ارشد مغل (محسن) کا شکریہ کہ جس کی وجہ سے یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں، اس زبردست انداز میں موجود ہے۔

جاوید مغل تیموری

زلزلے!

تو نے مرے باغ کے غنچے توڑے

خاک ہو جائیں تو چہرے نہیں دیکھے جاتے
اب اِن آنکھوں سے یہ لاشے نہیں دیکھے جاتے
زلزلے! تو نے مرے ''باغ'' کے غنچے توڑے
تجھ سے ہنستے ہوئے بچے نہیں دیکھے جاتے
ایک دو ہوں تو کوئی صبر کا دامن تھامے
شہر بھر کے تو جنازے نہیں دیکھے جاتے
کاش! اس بات کا ماؤں کو یقیں آ جائے
موت آ جائے تو رستے نہیں دیکھے جاتے
اب تو آنسو بھی نہیں آنکھ میں بہنے کے لئے
خشک آنکھوں سے جنازے نہیں دیکھے جاتے
شہر کا شہر ہوا گوروکفن سے محروم
اب سرخاک یہ لاشے نہیں دیکھے جاتے
آنکھ ملبے کی طرف اب بھی لگی ہے لیکن
دن نکل آئے تو سپنے نہیں دیکھے جاتے
طلب علم کی خاطر جو گئے تھے گھر سے
اُن کے بکھرے ہوئے بستے نہیں دیکھے جاتے

خالدعرفان

دُھندلکے

پھر آج وہی راستہ ہے
وہی قدموں کے نیچے گیلی سڑک
وہی برستا ہوا آسمان
وہی درختوں کی لمبی قطار ہے
اور پتوں پر پازیب کی طرح بجتی بوندیں
وہی نہر کا شفاف پانی ہے
جس میں بننے والے عکس کو
بارش کی بوندیں دھندلا رہی ہیں
وہی ہلکا سا دھندلکا ہے

اور دور دور تک پھیلا مہیب سناٹا
جس میں کبھی کبھی
کسی کے گزرنے سے ارتعاش پیدا ہوتا ہے
سب کچھ وہی ہے
بس آج میں تنہا ہوں

''تقدیر اتنی بے رحم کیوں ہوتی ہے .....دعا، خواہش، خوشی .....میرے لیے تو سب کچھ تم ہو اور تمھارے بعد نہ تو کوئی دعا ہونٹوں تک آتی ہے، نہ کوئی خواہش ہی دل میں مچلتی ہے اور نہ کوئی خوشی ہی چہرے پر بکھرتی ہے .....کبھی کبھی تو سوچتی ہوں کہ میں جی بھی رہی ہوں یا نہیں لیکن اگر سانسوں کا چلنا زندگی ہے تو ہاں میں جی رہی ہوں۔بس احساس مر چکا ہے .....امیدیں دم توڑ چکی ہیں .....خواہشیں کفن پہنے سو گئی ہیں ..... ہا.....لیکن میں زندہ ہوں.....''

سوچیں اب اکثر یونہی اس پر حاوی ہو جایا کرتی تھیں اور آج بھی یہی ہوا۔نہر کے شفاف پانی پر نظریں جمائے اس نے تھکے سے انداز میں اسی درخت کے تنے پہ سر ٹکا دیا، جس سے ٹیک لگائے وہ اتنی دیر سے کھڑی تھی۔دو آنسو چپ چاپ ہی گالوں پر لڑھک آئے لیکن اس نے آنسو پونچھنے کی کوشش نہیں کی بس آنکھیں بند کر لیں۔نجانے کتنی دیر وہ یونہی آنکھیں بند کیے کھڑی رہتی کہ اچانک اسے اپنے پیچھے ایک آواز سنائی دی۔

''آنکھیں بند کر لینے سے حقیقت نہیں بدلا کرتی.....''

اس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ ہاتھ باندھے اسی درخت کے تنے سے ٹیک لگائے مسکراتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''دانی!.....تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اسے اس وقت اس کی مداخلت سخت ناگوار

گزر رہی تھی۔

''فی الحال تو تمھیں ہی دیکھ رہا ہوں'' اس نے کسی قدر شوخ لہجے میں کہا تو اس نے گھور کر اسے دیکھا اور وہ فوراً ہی بات پلٹ گیا۔

''میں تو ان بوندوں کی بات کر رہا تھا جو اب آہستہ آہستہ تیز ہوتی جا رہی ہیں اور اگر ہم مزید کچھ دیر اور یہاں کھڑے رہے تو تمھارا تو پتا نہیں لیکن میں برساتی مینڈک ہرگز نہیں بننا چاہتا.....'' اس نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا تو ناچار اسے بھی اس کی تقلید کرنی پڑی۔

''تم کسی بھی بات کا سیدھا جواب کیوں نہیں دیتے'' دانیال کے ساتھ چلتے ہوئے اس نے کسی قدر چڑ کر کہا۔

''ڈیئر!.....جب سوال ہی الجھ جائیں تو جواب کیسے سیدھے رہ سکتے ہیں'' اس نے سڑک پر نظریں جمائے بڑے ہی گہرے لہجے میں کہا تھا اور وہ ٹھٹک کر رک گئی۔اس نے بھی شاید اس کا رکنا محسوس کر لیا تھا۔

''کیوں تم زندگی سے ایک قدم پیچھے چلنا چاہتی ہو.....وقت کو مٹھی میں قید نہیں کر سکتیں تم.....جس دن مٹھی کھولو گی نا سوائے خالی ہتھیلیوں کے تمھارے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا.....ایک سال گزر چکا ہے لیکن وہ لمحہ، وہ پل آج بھی تمھارا دامن تھامے ہوئے ہے.....'' دانیال نے پلٹ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''اپنی ذاتی زندگی میں مداخلت کی اجازت میں نے کسی کو نہیں دی.....تمھیں بھی نہیں.....''

اس کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی سخت ہو گیا تھا۔اس نے ایک خفگی بھری نظر اس پر ڈالی اور تیز تیز قدم اٹھاتی سڑک کراس کر کے اپنی کار کے پاس آ گئی۔کار کا دروازہ کھول کر اس

نے پلٹ کر دیکھا تو وہ اب بھی وہیں کھڑا تھا۔اس کے چہرے پر اداسی صاف نظر آ رہی تھی۔ اسے ندامت نے آ گھیرا اور اسے پشیمان دیکھ کر وہ خود ہی چلا آیا۔

''جانتی ہو تم میں سب سے اچھی بات کیا ہے.....تمھیں اپنی غلطی کا احساس فوراً ہی ہو جاتا ہے'' دانیال نے دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے اور مسکراتے ہوئے کہا، وہ بس اسے دیکھتی رہ گئی۔ان دونوں نے M.B.B.S ایک ساتھ ہی مکمل کیا تھا اور اب ہاؤس جاب کے بعد ایک ہی ہاسپٹل میں جاب کر رہے تھے لیکن کالج کے زمانے کی یہ بے تکلف دوستی اب کبھی کبھی اسے الجھا دیا کرتی تھی۔اس کے سادہ سے الفاظ بھی اس کی بولتی نگاہوں کے سامنے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا کرتے تھے۔

''ہے.....کہاں کھو گئیں'' دانیال نے اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجا کر کہا تو وہ چونک اٹھی۔

''کہیں نہیں.....'' اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''چلو بیٹھو گاڑی میں'' دانیال نے بے دھیانی میں کار کے دروازے پر ہاتھ رکھا تو اس کا ہاتھ اس کے ہاتھ کو چھو گیا۔اس نے فوراً ہی اپنا ہاتھ کھینچا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔اس کے بیٹھتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا۔

''میں ہاسپٹل پہنچا تو ڈاکٹر عارف نے بتایا کہ تم صبح پانچ بجے ہی چلی گئی تھی۔موبائل تم اٹھا نہیں رہی تھی اس لیے میں نے گھر فون کر دیا اور آنٹی پریشان ہو گئیں.....آئندہ نائٹ ڈیوٹی کر کے سیدھے گھر جانا یا کم از کم آنٹی کو بتا دینا.....اور ہاں یہ ایڈوائس نہیں ریکوسٹ ہے.....''اس نے کھڑکی پر ہاتھ رکھے نرم لہجے میں کہا۔

''میں یاد رکھوں گی.....'' اس نے آہستہ سے کہا اور گاڑی سٹارٹ کر دی۔

''کاش میں تم سے پہلے ملا ہوتا یا پھر کبھی نہ ملا ہوتا.....'' دانیال کے لہجے میں حسرتیں

پنہاں تھیں اور پھر وہ آہستہ روی سے چلتا ہوا اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ گہری نیند میں تھی کہ موبائل بجنے کی آواز پر اٹھ بیٹھی۔نیم وا آنکھوں سے اس نے ٹٹولنے کے انداز میں سائیڈ ٹیبل سے موبائل اٹھایا اور آن کر کے کان سے لگا لیا۔

''ہیلو'' اس کی آواز نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"happy birthday to my sweet heart!.....happy birthday to you"

دوسری طرف سے باقاعدہ گانے کی طرح گا کر وش کیا گیا اور اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

'' فراز'' خوشی کے مارے اس کی ہلکی سی چیخ نکل گئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کیسی ہے میری زندگی؟'' دوسری طرف سے بشاشت سے بھرپور لہجے میں اس نے پوچھا۔

''میں تو ٹھیک ہوں....لیکن....تم کہاں سے بول رہے ہو؟'' اریب کی آواز میں خوشی اور حیرت کا ملا جلا تاثر تھا۔

''یار!.....آئی تھنک ،سب لوگ منہ سے ہی بولتے ہیں'' فراز نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ایک پل کے لیے تو وہ اس کے جواب پر خاموش ہوگئی لیکن دوسرے ہی پل فون پر اس کا قہقہہ بلند ہوا اور اسے بے اختیار ہی موبائل کانوں سے پیچھے کرنا پڑا۔

'' فراز!.....i'll kill you ''

''ہم تو پہلے ہی تم پر مر چکے ہیں.....اب مرے ہوئے کو اور کیا مارو گی.....'' اس نے اتنے گہرے لہجے میں کہا کہ اس کی نظریں خود بخود جھک گئیں۔

''اریب!.....جانتی ہواس وقت میرادل کیا کہہ رہا ہے.....کہ میں تمھارے سامنے ہوتااورتمھاری ان جھکی ہوئی آنکھوں کو چوم لیتا'' وہ بےخودی کے عالم میں بول رہا تھا۔

''اچھا.....تو آجاؤ.....روکا کس نے ہے'' اس نے ذراشوخی سے کہا۔

'' سوچ لومسز اریب فراز! .....بعد میں بھاگنے کی تمام راہیں مسدود ہو جائیں گی.....'' فراز نے بھی بالکل اسی کے انداز میں کہا تھا۔

''میں نے تو سوچ لیا.....لیکن جناب کیپٹن صاحب بھی یادرکھیں کہ ابھی رخصتی کی رسم باقی ہے'' اریب نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ڈونٹ وری.....وہی رسم تو پوری کرنے آیا ہوں .....''

''وٹ .....تمھارا مطلب ہے کہ تم .....'' بےانتہا خوشی کے احساس میں گھر کر اس سے بات مکمل نہ ہوئی۔

''یقین نہیں آتا تو کھڑکی سے نیچے دیکھو .....'' اس نے اتنے یقین سے کہا کہ وہ بوکھلا گئی۔

''کیا.....تم.....'' وہ تیزی سے بیڈ سے اتر کر کھڑکی کی طرف بھاگی اور اس کی بےقرار نظریں خالی سڑک پر بھٹکنے لگیں۔

''کیا ہوا.....میں نظر آیا.....'' اس نے شرارت سے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''فراز!.....you cheater!.....سامنے آؤ ذرا چھوڑوں گی نہیں تمھیں.....'' اس کے یوں ہنسنے پر اریب نے خفگی بھرے انداز میں کہا اور واپس بیڈ پر آ گئی۔

''میں بھی تو یہی چاہتا ہوں کہ تم مجھے کبھی نہ چھوڑو.....یہ سانسیں بےشک ساتھ چھوڑ جائیں لیکن تم میرا ساتھ کبھی مت چھوڑنا.....'' اس نے ایک جذب کے عالم میں کہا تھا۔

''ہاں....بس یہی تو آتا ہے تمھیں۔ پہلے خفا کرتے ہو اور پھر ایسی باتیں کر کے منا بھی

لیتے ہو ''

''رئیلی اریب!....میرا دل تو چاہ رہا تھا کہ ایسے ہی تمھیں وش کروں لیکن پھر سوچا کہ اگر کسی نے آدھی رات کو مجھے تمھارے گھر کے نیچے کھڑا دیکھ لیا تو کہیں چور ڈاکو سمجھ کر پولیس کو فون ہی نہ کر دے۔اس لیے نہیں آیا.....لیکن کل ہم ساتھ میں ڈنر کر رہے ہیں۔اینڈ دیٹ از فائنل''

''اس کا مطلب تم یہیں لاہور میں ہو'' وہ اب بھی بے یقین تھی۔

''صرف یہیں نہیں بلکہ خاص تمھارے لیے کل رات ہی آیا ہوں۔''

''لیکن پرسوں تو تم نے فون پر کہا تھا کہ نہیں آ رہے ہو'' وہ حیران بھی تھی اور خوش بھی۔

''اگر پہلے بتا دیتا تو سرپرائز کہاں رہتا'' اس کے انداز میں شرارت نمایاں تھی۔

''ہاں....تم اور تمھارے سرپرائزز ''

''اچھا وہ سب چھوڑو.....کل تیار رہنا میں ٹھیک آٹھ بجے تمھیں پک کروں گا.....او کے اینڈ بائے.....سویٹ ڈریمز'' دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا تو وہ سرشاری میں موبائل ہاتھ میں پکڑے لیٹ گئی۔

☆ ☆ ☆

فراز نے گاڑی ایک نوتعمیر شدہ گھر کے سامنے روکی تو وہ حیرانی سے پوچھنے لگی

''فراز! یہ گھر.....ہم تو ڈنر پر جا رہے تھے نا.....یہ گھر کس کا ہے؟ ''

''تم آؤ تو سہی.....پھر بتاتا ہوں'' اس نے دروازہ کھول کر اترتے ہوئے کہا تو وہ بھی اتر گئی۔گاڑی کی آواز سن کر اندر موجود چوکیدار پہلے ہی گیٹ کھول چکا تھا۔فراز اس کا ہاتھ تھام کر اسے اندر لے گیا۔چھوٹے سے لان اور راہداری سے گزر کر وہ انٹرنس ڈور کے سامنے پہنچ گئے۔

''اب تم پہلے اپنی آنکھیں بند کرو'' فراز نے انٹرنس ڈور کے لاک پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''آنکھیں.....لیکن کیوں.....؟''

''اوہو .....سوال مت کرو.....do it as I say'' اس نے رازداری برتتے ہوئے کہا۔

''او کے بابا!.....یہ لو بند کرلیں.....''

فراز اس کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہوا اور کہا ''اب تم آنکھیں کھول سکتی ہو''

فراز نے اس کے پیچھے کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھتے ہوئے اس کے کان کے قریب سرگوشی کے انداز میں کہا اور اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں۔

اس کے سامنے ایک کھلا سا لاؤنج تھا جو کسی قدر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔صرف جہاں وہ کھڑی تھی وہاں سے ٹیبل تک چھوٹی چھوٹی رنگ برنگی کینڈلز کی دو قطاروں سے راستہ بنا ہوا تھا۔ٹیبل بھی کینڈلز کی روشنی سے جگمگا رہی تھی۔

''فراز! یہ.....'' اس نے ابھی کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ فراز نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

''شی.....ابھی کچھ مت کہو....آؤ میرے ساتھ.....'' وہ اسے کاندھوں سے تھامے آگے بڑھنے لگا۔ٹیبل کے کناروں پر کینڈلز روشن تھیں اور ٹیبل کے چاروں کونوں میں کرسٹل کے باؤلز میں پانی بھر کر اسے سرخ گلابوں سے بھر دیا گیا تھا۔درمیان میں کینڈلز ہی کی مدد سے ہارٹ بنایا گیا تھا اور ہارٹ کے درمیان میں ہارٹ شیپ کا چاکلیٹ کیک رکھا ہوا تھا۔

"..... its so beautiful" محبت کے اتنے اچھوتے اور خوبصورت اظہار پر اس کی آنکھیں بھر آئیں اور اس نے فراز کے سینے میں منہ چھپا لیا۔

''ہے.....یہ خوبصورت پل صرف ہمارا ہے اور اس میں کسی اور کی مداخلت مجھے بالکل

گوارا نہیں پھر چاہے وہ آنسو ہی کیوں نہ ہوں'' فراز نے اس کا چہرہ اوپر کر کے اپنی انگلی کی پوروں سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''تو رلایا بھی تو تم نے ہی ہے .....'' اس نے ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''کمال ہے.....محبت کا اظہار بھی رلا دیتا ہے.....تم بھی نا.....''

''تم نہیں سمجھو گے.....جب محبت اتنی زیادہ ہو کہ اپنا دامن چھوٹا لگنے لگے تو آنکھیں بھر ہی آتی ہیں'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اب تم کہہ رہی ہو تو ماننا ہی پڑے گا.....اینی وے، اپنا گفٹ نہیں لو گی'' وہ شرارتی نظروں سے دیکھتا اس کے کچھ اور قریب ہوا تو وہ نروس سی ہو گئی۔

''نہیں.....مجھے نہیں چاہیے'' اریب نے گھبراتے ہوئے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور وہ جھینپ کر رہ گئی۔

''میں تم سے جتنی محبت کرتا ہوں نا اس سے کہیں زیادہ تم مجھ پر اعتبار کرتی ہو اور یہ بات میں کبھی نہیں بھول سکتا'' اس نے مان بھرے لہجے میں کہا اور دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اریب کی جھکی ہوئی نظروں میں اس کے لیے عقیدت کچھ اور بڑھ گئی۔

''میرا گفٹ .....'' اس نے استحقاق بھرے انداز میں اپنی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا دی۔

''ایک گفٹ تو گھر پر تمھارا انتظار کر رہا ہے اور دوسرا یہ رہا.....'' فراز نے اپنے پیچھے سوئچ پینل کے سارے بٹن دبا دیئے اور پورا گھر روشنی میں نہا گیا۔ اس قدر روشنی سے ایک پل کے لیے اس کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔

'' یہ تو.....'' اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کہے۔

''یہ ہے ہمارا گھر.... جہاں تمھیں رخصت ہو کر آنا ہے .....ہمیشہ کے لیے..... میرے پاس .....'' اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے محبت بھری نظروں سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

'' فراز!.....'' اس کی آنکھیں پھر سے بھیگنے لگی تھیں۔

''کیا خیال ہے.....بیڈروم بھی نہ دیکھ لیا جائے...'' اس کی نم آنکھیں دیکھ کر اس نے شرارتی انداز میں کہا۔

''جی نہیں.....کوئی ضرورت نہیں'' اریب نے مسکراتے ہوئے اسے گھورا۔

''تو چلو پھر کیک کاٹ لیں.....کیوں کہ امی اور بابا بھی اب تک تمھارے گھر پہنچ چکے ہوں گے''اس نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''کیا.....تایا جی اور تائی جی گھر آنے والے ہیں.....اور تم مجھے اب بتا رہے ہو''

'' ڈونٹ وری.....وہ چاچو اور چچی سے ہی ملنے گئے ہیں..... یو نو شادی کی ڈیٹ .....اور میرے خیال سے ایسے میں تمھاری غیر موجودگی ہی ٹھیک ہے''اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو یہ بات ہے.....لیکن فراز! اتنی جلدی کیا ہے.....میرا ہاؤس جاب تو پورا ہو لینے دو.....'' وہ خوش بھی تھی اور تھوڑی فکرمند بھی۔

''تو میں کون سا تمھیں روک رہا ہوں ہاؤس جاب سے .....لیکن مجھ سے اب اور انتظار نہیں ہوتا..... پہلے ہی تمھارے M.B.B.S کے چکر میں اتنے خوبصورت سال برباد ہو گئے ہیں.....اب کیا مجھے کنوارا ہی مارنے کا ارادہ ہے''اس کا لہجہ ہلکی سی ناگواری لیے ہوئے تھا۔

''کنوارے اور تم.....''

''اور نہیں تو کیا.....صرف نکاح half marriage ہی ہوتا ہے.....اسی لیے ابھی

میں کنواروں ہی کی صف میں کھڑا ہوں.....'' اس نے اتنی بیچارگی سے کہا کہ وہ ہنس پڑی۔

☆ ☆ ☆

کبھی یوں بھی ہوتا ہے
محبت اتنی زیادہ ہوتی ہے
کہ اسے جینے کے لیے
زندگی کم پڑ جاتی ہے

اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے اس نے ہاسپٹل سے چھٹی لے لی تھی اور اب وہ ایک فوٹو فریم ہاتھ میں لیے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ یہ نکاح کے دن کی تصویر تھی جب فراز اس کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا تو ارشیہ نے اس خوبصورت لمحے کو کیمرے میں قید کر لیا تھا۔ تصویر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ فراز کی وہ سرگوشی اس کے کان میں گونجنے لگی اور اس نے بے خود ہو کر آنکھیں موند لیں۔

''آج تم اتنی خوبصورت لگ رہی ہو کہ اگر تمھارا M.B.B.S ہمارے بیچ دیوار بن کر نہ کھڑا ہوتا تو میں آج ہی رخصتی کروا لیتا.....اور افسوس کہ میں شاعر بھی نہیں ورنہ آج ہی ایک دیوان تمہارے نام لکھ ڈالتا.....''

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ اس لمحے نے پوری طرح اسے اپنے حصار میں جکڑ لیا تھا اور وہ بھی اس قید سے رہائی نہیں چاہتی تھی لیکن ارشیہ نے دروازے پر دستک دے کر اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے ہتھیلی کی پشت سے گالوں پر بہتے آنسوؤں کو صاف کیا اور فریم واپس سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اس کے جواب نہ دینے پر دوسری دستک دے کر وہ خود ہی اندر چلی آئی۔

''مجھے لگا آپ سو رہی ہیں'' اسے جاگتے دیکھ کر ارشیہ نے بغور اس کی طرف دیکھتے

ہوئے کہا۔

''نہیں.....بس وہ.....تم بتاؤ کیا کام تھا'' اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا لیکن براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے گریز ہی کیا۔

''دانیال بھائی آئے ہیں.....آپ آ رہی ہیں یا میں انہیں یہیں لے آؤں''

''میں آتی ہوں.....تم چلو.....''

وہ بیڈ سے اتر کر واش روم میں گھس گئی۔اچھی طرح پانی کے چھینٹے مارنے کے بعد وہ باہر آئی تو آنکھوں کی سرخی خاصی کم ہو چکی تھی۔وہ لاؤنج میں امی کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔اسے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیسی.....'' اس نے اپنے سامنے ٹیبل پر رکھا گلدستہ اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہوں.....'' اریب نے گلدستہ لیکر واپس ٹیبل پر رکھ دیا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔اس کے بیٹھتے ہی وہ بھی بیٹھ گیا۔

''تم لوگ باتیں کرو۔میں ابھی آتی ہوں'' امی اٹھ کر چلی گئیں۔

''تم آج ہاسپٹل نہیں گئے''

''ہاسپٹل سے ہی آ رہا ہوں.....بڑی مشکل سے ڈاکٹر عارف سے ایک گھنٹے کی چھٹی لیکر آیا ہوں.....لیکن لگتا ہے میرا آنا بے کار ہی رہا'' اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''کیا مطلب.....؟''اریب نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

''اور نہیں تو کیا .....تم تو یہاں بالکل ٹھیک ہو.....میں نے تو سوچا تھا کہ سرخ سرخ آنکھیں لیے بیڈ پر نیم دراز بے ہوشی کی حالت میں پڑی اریب سے میرا سامنا ہوگا لیکن تم

تو.....'' اس نے ذرا مایوسی کے انداز میں کہا تو وہ مسکرا اٹھی۔

''دانی! تم بھی نا..... بیمار کی عیادت ایسے کی جاتی ہے کیا''

''وہ مجھے نہیں پتا.....لیکن تمھارے جیسے بیمار کی عیادت تو ایسے ہی کی جانی چاہیے کیوں کہ تمھاری بیماری کی وجہ تم خود ہو.....تمھاری یہ نہ ختم ہونے والی سوچیں ہیں.....ان سوچوں سے خود کو آزاد کرلو.... بیماری خود بخود ختم ہو جائیگی....'' اس نے پرخلوص انداز میں مشورہ دیا۔

''سوچیں ہمارے اختیار میں کب ہوتی ہیں.....ہم تو بے بس پرندوں کی مانند ہیں جو کب قید کر لیے جائیں۔ پتا ہی نہیں چلتا'' اس کی نظریں اپنی ہتھیلیوں سے الجھ رہی تھیں۔

''اختیار میں تو شاید ہمارے کچھ بھی نہیں ہوتا لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم کوشش کرنا ہی چھوڑ دیں.....امید پر دنیا قائم ہے اور اسی امید پر پنجرے میں قید بے بس پرندہ بھی جیتا ہے'' وہ کیا سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔

''اس پرندے کے پاس جینے کی امید ہے لیکن میرے پاس ایسی کوئی امید بھی نہیں جس کے سہارے میں جینے کی کوشش کروں.....'' کوشش کے باوجود اس کا لہجہ بھیگا ہوا تھا شاید اس کی تھوڑی دیر پہلے کی جذباتی کیفیت تھی کہ وہ اپنے خول میں بند نہیں رہ پائی تھی۔

'' حادثوں سے زندگی نہیں رکتی ..... ہاں ہم کچھ دیر کے لیے ٹھہر ضرور جاتے ہیں.....لیکن کب تک .....سفر کا آغاز تو بہر حال ہمیں کرنا ہی پڑتا ہے.....اور جتنی جلدی تم یہ سمجھ لو اتنا ہی اچھا ہے.....''

''میں ابھی آتی ہوں.....'' وہ اس کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی، اس لیے فوراً ہی وہاں سے اٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

شادی کی تیاریاں زور وشور سے جاری تھیں۔رمضان ہونے کے باوجود رات کو دونوں کزنز اور ارشیہ ڈھولک لے کر بیٹھ جاتیں اور پھر رات گئے تک اسے بھی جگائے رکھتیں۔آج رات بھی وہ لوگ دیر سے ہی سوئی تھیں اسی لیے سحری کے بعد وہ ساری لڑکیاں تو سو گئیں اور ابو کے جانے کے بعد پھوپھو اور امی بھی سو گئیں۔وہ سب بے خبر سو رہے تھے لیکن زلزلے کے شدید جھٹکوں نے ان سب کو اٹھنے پر مجبور کر دیا۔جھٹکے اتنے شدید تھے کہ انھوں نے پورا بیڈ ہلا کر رکھ دیا تھا۔ارشی گھبرا کر اپنے بیڈ سے اس کے بیڈ پر آ بیٹھی اور اریب کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر آنکھیں بند کرتے ہوئے اس کے لب ورد کے سے انداز میں زور زور سے ہلنے لگے۔کچھ دیر بعد جھٹکوں کی شدت کم ہوتے ہوتے ختم ہوگئی۔وہ دونوں ابھی کمرے سے نکلنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھیں کہ امی پکارنے لگیں۔

''ارشی!.....اریب!.....تم دونوں ٹھیک ہو نا؟''ان کی آواز بھی گھبرائی ہوئی سی تھی۔

''جی امی!.....''ارشیہ نے کمرے سے ہی آواز لگائی اور پھر وہ دونوں کمرے سے نکل کر باہر لاؤنج میں آ گئیں جہاں امی کے ساتھ ساتھ پھوپھو اور ان کی دونوں بیٹیاں بھی موجود تھیں۔ان سب کے چہروں سے پریشانی چھلک رہی تھی کیوں کہ سب زلزلے سے خوف زدہ تھے۔پھر کافی دیر تک وہ زلزلے کے بارے باتیں کرتے رہے کہ یہ بہت شدید تھا۔

دوپہر کو بھی سب ٹی وی لاؤنج میں جمع تھے اور سامنے ٹی وی چل رہا تھا۔اس پر جو نیوز دکھائی جا رہی تھی وہ زلزلے کی ہولناکی کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔شمالی علاقوں میں تباہی و بربادی کا منظر اس قدر دہشتناک تھا کہ اریب سے دیکھا ہی نہیں گیا۔وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ویسے بھی اس وقت وہ اپنی زندگی کے سب سے

حسین لمحوں کو جی رہی تھی۔شادی تک کا یہ ایک مہینہ ایک ایسا خوبصورت سفر تھا جس کا ایک ایک پل وہ فراز کی محبت میں ڈوب کر طے کر رہی تھی۔اس لیے جذبات کی جس انتہا پر وہ موجود تھی وہاں ایسے مناظر دیکھ کر فرار کی راہ اختیار کرنا ایک فطری عمل تھا۔شام تک وہ اپنے کمرے میں ہی بند رہی۔ارشیہ نے مختصر طور پر اسے حالات کی سنگینی کے بارے میں بتا دیا تھا۔وہ کھڑکی کے پاس کھڑی فراز کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ ارشیہ چلی آئی۔

''آپی!.....'' وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھی اس لیے اس کے پکارنے پر چونک اٹھی۔

'' ہوں .....'' اس نے مڑ کر دیکھا۔

''فراز بھائی آئے ہیں آپ سے ملنے'' وہ کہہ کر فوراً ہی چلی گئی۔

'' فراز! .....تم یہاں .....؟'' اس نے حیرانی سے اسے دروازے میں کھڑے دیکھ کر پوچھا۔اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور آہستہ روی سے چلتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔

''کیا بات ہے فراز!.....تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟''اس کے چہرے پر پھیلی سوچ کی لکیریں دیکھ کر اریب نے پوچھا۔وہ کچھ دیر بنا پلکیں جھپکائے اسے دیکھتا رہا اور پھر اریب کے چہرے پر لہراتی زلفوں کو بڑے پیار سے اس کے کان کے پیچھے کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''مجھے جانا ہے.....میری چھٹیاں کینسل ہوگئی ہیں''

''کیا....لیکن تم تو شاپنگ کے لیے ایک ہفتے کی چھٹیاں لیکر آئے تھے...'' اریب نے بے قرار ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''وجہ تم جانتی ہو'' فراز نے اس کے ہاتھ کا بوسہ لینا چاہا تو اس نے ایک جھٹکے سے اپنا

ہاتھ چھڑا لیا۔

''میں بس اتنا جانتی ہوں کہ ایک مہینے بعد ہماری شادی ہے اور بس.....''

''سمجھنے کی کوشش کرو اریب!.....زلزلے سے جو تباہی ہوئی ہے تم اس سے بے خبر تو نہیں.....'' فراز نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ بھڑک اٹھی۔

''میں کچھ نہیں جانتی .....''

''ہے.....ادھر دیکھو میری طرف.....'' فراز نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام لیا ''پلیز ٹرائے ٹو انڈر سٹینڈ.....اگر تم ایسے کرو گی تو میں جا نہیں پاؤں گا.....انھیں ضرورت ہے میری.....''

''اور میں.....مجھے بھی تو تمھاری ضرورت ہے.....'' اس نے آنسوؤں بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم سے زیادہ مجھے تمھاری ضرورت ہے .....میں تمھارے بغیر ادھورا ہوں اور یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو اور یہ آنکھیں.....'' فراز نے بہت نرمی سے اس کی آنکھوں کو چھوا اور اس نے بے اختیار آنکھیں موند لیں ''اور یہ آنکھیں میرا گھر ہیں.....انہیں چھوڑ کر کہاں جاؤں گا'' اس نے باری باری اس کی آنکھوں پر اپنے ہونٹ ثبت کر دیئے۔

''اریب!.....بس کچھ ہی دنوں کی تو بات ہے پھر تم میری دلہن ہوگی..اور پھر.....''

اس نے بہت دھیرے سے اس کے کان میں سرگوشی کی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔وہ آہستہ آہستہ اس سے دور ہٹنے لگا۔اریب نے اسے خود سے دور ہوتے دیکھ کر بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا۔

'' فراز!.....''

اس نے نرمی سے انکار میں سر ہلاتے ہوئے اریب سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور فوراً کمرے

سے نکل گیا۔

''فراز.....فراز.....'' وہ پکارتی ہوئی اس کے پیچھے دوڑی لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ دروازے میں کھڑی آنسو بہاتی رہی اور وہ مین ڈور کراس کر گیا۔

☆ ☆ ☆

فراز کو گئے ہوئے دو دن ہو گئے تھے۔ نیٹ ورکس تو ویسے ہی بے کار ہو چکے تھے، اس لیے اب تک اس کی خبر نہیں آئی تھی ۔ بس ٹی وی کے ذریعے ہی انھیں آرمی کی activities کا پتا چل رہا تھا۔ وہ سب لاؤنج میں بیٹھے تھے اور ٹی وی چل رہا تھا۔ تایا جی اور تائی جی اس کی شادی کا جوڑا لے کر آئے تھے اور وہ شادی کا جوڑا، چوڑیاں اور جیولری گود میں لیے لاؤنج میں ان کے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ اچانک ٹی وی پر ایک بریکنگ نیوز سن کر وہ سب چونک اٹھے۔

''امداد پہنچانے والے آرمی کے ایک ہیلی کاپٹر کے ساتھ حادثہ۔ پائلٹ کے ساتھ کیپٹن فراز اور سیکنڈ لیفٹیننٹ عادل موقع پر ہی جاں بحق....''

یہ نیوز سن کر اریب شاک کے عالم میں کھڑی ہو گئی اور اس کی گود میں رکھا شادی کا جوڑا زمین پر جا گرا۔ چوڑیاں فرش پر گر کر ٹوٹ گئیں اور جیولری بکھر کر رہ گئی۔

''نہیں.....نہیں.....نہیں.....'' وہ مسلسل اسی ایک لفظ کی تکرار کرتے کرتے چکرا کر گر پڑی۔

☆ ☆ ☆

یادوں کے ساحل پر
جب سوچ کی موجیں آ کر ٹکراتی ہیں
تو ہر زخم

ایک بار پھر تازہ ہو جاتا ہے
اور میں ان زخموں کو
پھر سے بھرنے کی کوشش کرنے لگتی ہوں
لیکن میری سوچیں
ہر بار میری کوشش ناکام بنا دیتی ہیں
اور پھر سے مجھے
وہیں لے جا کر کھڑا کر دیتی ہیں
جہاں سے میں نے
سفر شروع کیا تھا

وہ اپنے کیبن میں کرسی پر نیم دراز آنکھیں موندے بیٹھی تھی کہ دانیال ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر چلا آیا۔اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں لیکن اس کے چہرے کے تاثرات ناقابل فہم تھے۔

''یہ ڈاکٹر عارف کیا کہہ رہے ہیں اریب!.....'' دانیال کا لہجہ خفگی لیے ہوئے تھا۔

''کیا کہہ رہے ہیں'' وہ جان بوجھ کر انجان بن گئی۔

''یہی کہ جو میڈیکل ٹیم مظفر آباد اور شمالی علاقوں کے میڈیکل ٹور پر جا رہی ہے تم نے اس میں اپنا نام دیا ہے اور یہی نہیں بلکہ ریکوسٹ کی ہے کہ تمھیں وہیں کسی جگہ مستقل اپوئنٹ بھی کر دیا جائے''اس کے ماتھے کے بلوں میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔

''تو تم خوش نہیں ہوئے .....یہی تو چاہتے ہو نا تم سب کہ میں زندگی سے ایک قدم پیچھے نہیں بلکہ زندگی کے ساتھ قدم ملا کر چلوں .....تو وہی کرنے کی کوشش کر رہی ہوں'' اریب نے بڑے پرسکون انداز میں کہا۔

''ہا.....for your kind information ڈاکٹر اریب!.....آپ زندگی کے ساتھ نہیں بلکہ اس سے ایک قدم آگے چلنے کی کوشش کر رہی ہیں.....اور یہ زندگی سے فرار ہے.....'' اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ رینگ گئی۔

''ڈاکٹر دانیال!.....کیا اب زندگی جینے کا فن مجھے آپ سے سیکھنا ہوگا'' اس کے انداز دیکھ کر اس کا لہجہ بھی خود بخود بیگانہ ہوگیا۔

''شاید ہاں.....کیوں کہ تم تو.....'' وہ کوئی سخت سا جملہ کہنے جا رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر ناگواری کا تاثر دیکھ کر اسے اپنے رویے کا احساس ہوگیا۔''سوری..... I did not mean that.....میں تو صرف تمھیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ.....''

''پلیز دانی!.....مجھے اپنی زندگی اپنے طریقے سے جینے دو....''اس کی معذرت اس کے لہجے میں بھی نرمی لے آئی تھی۔

''کیسے جینے دیں اریب!.....تم خود کو ہم سے الگ کیوں سمجھتی ہو.....تمھارے گھر والے، میں اور تمھارے سب دوست.....ہم سب تمھاری خوشی ہی تو چاہتے ہیں'' اس کا لہجہ خلوص سے بھرپور تھا۔

''خوشی.....میری زندگی سے خوشی تو اسی دن چلی گئی تھی جب فراز کو مجھ سے تقدیر نے چھین لیا تھا.....اب تو بس یادیں ہیں جن کے سہارے جینے کی کوشش کر رہی ہوں اور وہ بھی اس لیے کہ جینا میری مجبوری ہے کہ زندگی جو ابھی باقی ہے.....اسی لیے میں وہاں جا رہی ہوں کہ شاید جو زندگی میرے کسی کام کی نہیں وہ ان کے کسی کام آجائے.....ویسے بھی ان لوگوں کو ہماری ضرورت ہے اور میں وہاں جاؤنگی تو شاید ان کے درد اور تکلیفیں دیکھ کر مجھے اپنا درد کم لگنے لگے'' اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تھے۔اس لیے وہ نظریں چرا گئی۔

''میں جانتا ہوں کہ فراز تمھاری زندگی کی اولین خوشی تھا لیکن ایک بات تم بھول رہی

ہو.....اگر زندگی اس کے جانے کے بعد نہیں رکی تو خوشی بھی تمھاری زندگی میں ضرور لوٹے گی۔بس تمھیں اسے ایک موقع دینا ہوگا.....اور ہوسکتا ہے کہ خوشی تمھارے آس پاس ہی ہولیکن تم ہی اسے محسوس نہ کر پا رہی ہو.....'' دانیال نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے ہی معنی خیز انداز میں کہا اور وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔دانیال کی آنکھوں میں چھپے رنگ اس کے لیے نا آشنا نہیں تھے لیکن یہ آنکھیں ضرور اس کے لیے نا آشنا تھیں اسی لیے اس کے چہرے پر سختی خود بخود عود آئی۔

''اریب!....میں تم سے.....''

اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتا اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔

''بس دانیال!.....اس سے آگے ایک لفظ بھی مت کہنا.....میں نے تم میں ایک بہت اچھا دوست پایا ہے اور میں اسے کھونا نہیں چاہتی'' اس نے دوٹوک انداز میں کہا اور کیبن سے باہر جانے کے لیے قدم آگے بڑھا دیئے لیکن دانیال کے لفظوں نے اسے چند قدم پر ہی رک جانے پر مجبور کر دیا۔

''ایک منٹ اریب!.....آج میں تمھیں اپنی بات سنے بغیر نہیں جانے دوں گا'' وہ چلتا ہوا اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا لیکن اس نے منہ موڑ لیا۔

''تم فراز کی یادوں کے سہارے جینا چاہتی ہو نا تو جیو.....میں کب تمھیں روک رہا ہوں.....میں تو بس زندگی کے سفر میں تمھارے ساتھ چلنا چاہتا ہوں اور یقین کرو میں بدلے میں تم سے کچھ نہیں چاہتا.....تمھاری محبت بھی نہیں..... I just want to marry you'' اس کے لہجے میں اتنی گہرائی اور سچائی تھی کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔

''یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری زندگی میں فراز کے علاوہ کسی اور کے لیے کوئی جگہ نہیں،تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو....''

وہ حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔اس کا یہ روپ اس کے لیے بالکل نیا اور انوکھا تھا۔

''ہاں .....کیوں کہ میں تم سے جتنی محبت کرتا ہوں وہ ہم دونوں کے لیے کافی ہے.....میں صرف تمھارا ساتھ چاہتا ہوں....'' اس نے پر یقین لہجے میں کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''نہیں دانیال!....یہ ناممکن ہے.....''اریب نے ایک جھٹکے سے اس پر سے اپنی نظریں ہٹائیں اور اس سے دو قدم آگے ہو کر کھڑی ہو گئی۔

'' لیکن کیوں.....میں تو.....''

''پلیز دانی!.....میں تم سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتی.....میرا فیصلہ اٹل ہے.....اور ہاں آج کے بعد میرے راستے میں آنے کی کوشش بھی مت کرنا ورنہ مجھے ایک مخلص دوست کھو دینے پر ہمیشہ افسوس رہے گا اور مجھے یقین ہے کہ تم ایسا کبھی نہیں چاہو گے''

اریب نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر فیصلہ کن انداز میں کہا اور کیبن کا دروازہ کھول دیا۔

''اور اگر میں نے ایسی کوئی کوشش نہ کی تو مجھے ساری زندگی افسوس رہے گا کہ میں نے پہلی ہی بار میں ہمت ہار دی.....اس لیے اب ہمارے راستے تو ایک دوسرے سے ٹکراتے ہی رہیں گے.....بس دیکھنا یہ ہے کہ کون پہلے ہار مانتا ہے''

اس نے مسکراتے ہوئے پر عزم لہجے میں کہا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

اریب نے غصے میں زور سے دروازہ بند کیا اور دروازے سے کمر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ آنسو خاموشی سے اس کے گالوں پر بہنے لگے۔

وقت کا پنچھی پر لگائے اڑ رہا ہے
پرچھائیاں دھندلی پڑنے لگی ہیں
ماضی دامن چھڑاتا محسوس ہوتا ہے
لیکن وہ ایک شخص
جس کے نقش کو
ماہ وسال بھی دھندلا نہ سکے
جو ہر پل
مجھے اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے
اپنی قربت سے مہکاتا رہتا ہے
جو میرے اتنا قریب ہے
کہ بس ہاتھ بڑھاؤں
تو اسے چھو سکتی ہوں
لیکن
حقیقت اور واہمہ میں بہت فرق ہوتا ہے
شاید یہ فرق
میں کبھی سمجھ پاؤں
لیکن آج نہیں.....ابھی نہیں

☆ ☆ ☆

تعاقب

جنوری کی خنک شام میں ساحل سمندر پر موجود لوگوں کے لیے ڈوبتے ہوئے سورج کا یہ منظر اتنا سحر انگیز تھا کہ وہ سب اپنے اردگرد سے بے نیاز اس حسین لمحے میں کھو سے گئے تھے۔ زیادہ تعداد ینگ کپلز کی تھی جو اپنی زندگی کے ان لمحوں کو خوبصورت یاد بنا لینا چاہتے تھے تا کہ اس مصروف زندگی میں اگر وہ دوبارہ کبھی اس پل سے محظوظ ہونے یہاں نہ بھی آسکیں تو یہ یادیں اس احساس کو ہمیشہ زندہ رکھ سکیں گی جسے وہ آج محسوس کر رہے تھے۔

ان ینگ کپلز کے علاوہ یہاں لڑکے لڑکیوں کا ایک گروپ بھی موجود تھا جو خوب ہلا گلا کر رہا تھا۔ تاریکی میں مدغم ہوتی روشنی، آسمان پر پھیلی شفق کی سرخی، پرسکون سمندر میں وقفے وقفے سے اٹھتی لہروں کا شور..... ماحول اسقدر خوابناک تھا کہ بس اس میں کھو جانے کو جی چاہتا تھا لیکن ماحول کا یہ ہوشربا طلسم بھی اس گروپ پر کوئی اثر نہیں مرتب کر رہا تھا۔ وہ سب کے سب میوزک لگائے اپنی بے ہنگم سی اچھل کود میں مصروف تھے اور اسی گروپ میں سے ایک لڑکا ان سب سے کچھ دور سمندر پر نظریں

جمائے کھڑا تھا۔لہریں اس کے قدموں سے آ کر ٹکراتیں لیکن وہ دونوں ہاتھ جیبوں میں ٹھونسے یوں اطمینان سے کھڑا تھا جیسے کوئی دلچسپ کھیل دیکھنے میں مشغول ہو۔ اچانک اس نے گردن گھما کر اپنے دوستوں کی طرف دیکھا وہ سب اس سے بے پروا ہلے گلے میں مشغول تھے۔انہیں مصروف دیکھ کر وہ مطمئن ہو گیا۔جوتے تو اس نے پہلے ہی اتار رکھے تھے۔اب جھک کر اپنی جینز کے دونوں پائنچے فولڈ کئے اور پھر سیدھا ہو کر آہستہ آہستہ سمندر کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔اس کے چہرے پر کسی بھی قسم کے ڈر یا خوف کا تاثر نہیں تھا بلکہ اس کے برعکس وہ بہت ہی متجسس نظر آ رہا تھا۔اس کا دھڑ پوری طرح پانی میں ڈوب چکا تھا اور اب اسے پانی کے بڑھتے ہوئے دباؤ کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔اسی وقت اسے ایک چیخ سنائی دی۔شاید اس کے دوستوں میں سے کسی نے اسے دیکھ لیا تھا لیکن اس نے پلٹ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ آگے بڑھتا رہا۔اچانک اس کے قدموں نے زمین چھوڑ دی اور وہ خود کو آگے کی طرف گرنے سے روک نہیں پایا۔سمندر کا نمکین پانی تیزی سے اس کے نتھنوں میں گھستا چلا گیا۔اس نے سانس روکنے کی کوشش کی لیکن پانی کا دباؤ اسقدر زیادہ تھا کہ وہ کامیاب نہیں ہو پایا۔اس کا سانس گھٹنے لگا اور بالکل غیر ارادی طور پر اس نے زور زور سے ہاتھ پیر مارنے شروع کر دیئے۔اس کا ذہن ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔اس نے خود کو ہوش میں رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن اندھیرے بہت تیزی سے اس کے ذہن پر جھپٹنے لگے تھے۔

''وہاج!.....اپنا ہاتھ دو مجھے....'' ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ یہ وہ آخری الفاظ تھے جو اس کے کانوں نے سنے تھے اس کے بعد جیسے سارے احساسات ختم ہو گئے۔

آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ہاسپٹل کے بیڈ پر لیٹے پایا اس کے تمام دوست بھی وہیں

موجود تھے۔ان سب کے چہروں سے پریشانی چھلک رہی تھی۔

''یہ تم لوگوں کے منہ کیوں لٹکے ہوئے ہیں.....''

"come on guys,!I am not dead yet"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھنے کی کوشش کی۔

"thanks to God and then thanks to Jimi"

یہ تو اچھا ہوا کہ شیبا نے تمھیں دیکھ لیا اور جمی تمھیں بچانے دوڑ پڑا.....ہم تو گھبرا ہی گئے تھے....اور شکر ادا کرو اُن دو کوسٹ گارڈز کا جو وہاں اتفاقاً راؤنڈ لگانے آ گئے ورنہ تو نجانے کیا ہو جاتا.....'' فری نے اسے مسکراتے دیکھ کر اطمینان سے کہا۔

''اوہ.....تو وہ چیخ اس سٹوپڈ شیبا کی تھی'' اس نے یوں شیبا کو دیکھا جیسے اسے اس کی حرکت سخت ناگوار گزری ہو۔

''by the way وہاج!.....کیا میں جان سکتا ہوں کہ یہ کیا حرکت تھی.....جب تمھیں تیرنا نہیں آتا تو تم سمندر کے اتنے قریب گئے ہی کیوں....'' جمی کے لہجے میں خفگی کا عنصر نمایاں تھا۔

''میں تو صرف چہل قدمی کر رہا تھا'' وہاج نے کسی قدر لاپروائی سے کہا۔

''کہاں.....بیچ سمندر میں.....'' جمی نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''جمی!.....don't try to be my father'' اس نے درشتگی سے کہا تو وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

اس کے رویے نے سب کو ہی ہرٹ کیا تھا۔وہ سب اپنی اپنی جگہ خاموش ہو گئے تھے لیکن وہ یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ وہاج حسن اپنے برے رویے پر کبھی معذرت کرے یہ اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کہ رات کو سورج کا نکلنا۔حالانکہ وہ پچھلے چھ سالوں سے ایک

دوسرے کو جانتے تھے۔کالج کے فرسٹ ائیر سے لیکر اب فائنل ائیر تک نہ تو انھوں نے کسی کو اپنے گروپ میں شامل کیا تھا اور نہ کوئی ان کے گروپ سے نکل کر کسی اور گروپ میں شامل ہی ہوا تھا لیکن وہاج کا پل پل بدلتا مزاج کبھی کبھی انھیں ایک پل میں ہی اجنبی بنا دیا کرتا تھا اور اب تو وہ سب ہی اس کے مزاج کے عادی ہوتے جا رہے تھے۔پھر بھی کبھی کبھی اس کا رویہ انھیں بہت ہرٹ کر جاتا تھا اور پچھلے کچھ عرصے سے تو اس کے اس رویے میں کافی تلخی در آئی تھی۔دو بار ایکسیڈنٹ میں اس کی جان جاتے جاتے بچی تھی۔اب تک وہ اسے محض حادثہ ہی سمجھتے آئے تھے لیکن آج کے واقعے نے انھیں شک میں مبتلا کر دیا تھا۔

دروازہ کھلا تو حسن آفندی اور سلمی حسن آگے پیچھے چلتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

''وہاج!.....what,s wrong with you بیٹا!.....تمھارا دھیان کہاں ہوتا ہے آجکل....''سلمی اس کے پاس بیڈ پر آ کر بیٹھ گئیں جبکہ حسن آفندی بہت غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''nothing to worry مام!.....بس ذرا پیر پھسل گیا تھا''اس کا لہجہ ہلکی سی بیزاری لیے ہوئے تھا۔اس کے لہجے نے حسن آفندی کو چونکایا ضرور تھا لیکن وہ کچھ بولے نہیں۔

''انکل! آئی تھنک ہم لوگوں کو اب چلنا چاہیے۔ویسے بھی اب آپ اور آنٹی تو ہیں ہی یہاں، اس کا خیال رکھنے کے لیے۔حالانکہ جو خود اپنا خیال نہ رکھنا چاہے اس کے لیے دوسرے کیا کر سکتے ہیں''

جمی کو بھی اس کا لہجہ برا لگا تھا اس لیے وہ کہے بغیر نہ رہ سکا اور پھر تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔اس کے پیچھے باقی دوست بھی چلے گئے۔

''وہاج!.....تمھیں کوئی پرابلم تو نہیں.....کوئی ایسی بات جو تم ہم سے شیئر کرنا چاہو''

حسن آفندی نے بڑی عجیب نظروں سے اسے دیکھا۔

''no dad!'' اس نے لاتعلقی سے کہا تو سلمی اس کے انداز دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

''اگر واقعی کچھ نہیں تو ان سب باتوں کا کیا مطلب ہے.....حادثہ ایک بار ہوسکتا ہے، دو بار ہوسکتا ہے لیکن تیسری بار.....تم کیوں ہمیں کچھ اور سوچنے پر مجبور کر رہے ہو'' نہ چاہتے ہوئے بھی ان کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔

''اب میں کیا کہہ سکتا ہوں سوائے اس کے کہ یہ آپ کا وہم ہے..... any way

"dad! I want to take some rest"

اس نے کندھے اچکا کر کہا اور لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

''you .....'' اس سے پہلے کہ وہ غصے میں کچھ کہتے سلمی نے انھیں روک دیا۔

''اس وقت بات کرنا ٹھیک نہیں.....ہم اس سے بعد میں ڈسکس کریں گے'' سلمی نے کہا تو وہ ایک گہرا سانس بھر کر رہ گئے۔

☆ ☆ ☆

وہ جم جانے کے لیے کمرے سے نکلا تو حسن آفندی لاؤنج میں ہی موجود تھے لیکن وہ انھیں نظر انداز کرتا انٹرنس ڈور کی طرف بڑھ گیا اور وہ جو اتنی دیر سے اسی کے انتظار میں یہاں بیٹھے تھے، اسے یوں لاتعلقی سے اپنے قریب سے گزرتے دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھے۔

'' وہاج!.....''

'' یس ڈیڈ! .....'' اپنا نام سن کر وہ رک ضرور گیا تھا لیکن اس نے پلٹ کر دیکھنے کی

کوشش نہیں کی تھی۔

''come here.....مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے''انھوں نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

'' ڈیڈ!.....میں جم سے لیٹ ہورہا ہوں۔آپ پھر کبھی بات کرلیجئے گا''

اس نے اکتائے ہوئے انداز میں کہتے ہوئے پلٹ کرانھیں دیکھا۔اس کے اس انداز پرانھیں غصہ تو بہت آیا لیکن وہ برداشت کر گئے۔

''بیٹھوادھر آ کر..... پانچ منٹ سے کوئی فرق نہیں پڑ جائے گا''انھوں نے قطعیت سے کہا تو وہ کندھے اچکاتا ان کے بالکل سامنے والے صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔

پچھلے کچھ مہینوں میں اس کی عادات اور سوچ تک میں ایک نامعلوم سی تبدیلی آ چکی تھی کہ ان کے لیے یہ سب کچھ حیران کن تھا۔بچپن ہی سے وہ کچھ منفرد لیکن بریلینٹ تھا۔ہمیشہ روٹین سے ہٹ کر کچھ نیا اور منفرد کرنے کی کوشش میں رہتا تھا۔اب تک تو وہ اسے اچھا سائن سمجھتے آئے تھے لیکن اب اس کی یہی خوبی ان کے لیے پریشانی کا باعث بن گئی تھی۔وہ بغور اس کا جائزہ لینے لگے۔فرنچ کٹ ڈاڑھی،کندھوں تک آتے بال جن کی شاید کئی مہینوں سے کٹنگ نہیں کروائی گئی تھی، گلے میں لٹکتی موٹی سی سلور چین،ایک لمبی بلیک ڈوری سے لٹکتا سلور، بلیک کلر کا پینڈنٹ،کلائی پر بندھا بریسلٹ ،بلیک کلر کا ٹراؤزر جس کے ایک پائنچے پر وائٹ کلر سے scorpio پینٹ کیا گیا تھا اور بلیک اینڈ وائٹ لائننگ کی ٹی شرٹ پہنے وہ کہیں سے بھی انڈسٹریلیسٹ حسن آفندی کا اکلوتا بیٹا نظر نہیں آ رہا تھا۔

''یہ کیا حالت بنا رکھی ہے.....اپنی نہیں تو کم از کم ہماری ہی عزت کا خیال کرلیا کرو'' انھوں نے قدرے ناگواری سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ کا ارادہ بے بی سٹر بننے کا ہے تو آئی ایم سوری میں.....'' اس کے یوں

بدتمیزی سے بات کرنے پر وہ ایکدم غصے میں آ گئے۔

'' شٹ اپ یو ایڈیٹ!.....تم شاید بھول سکتے ہو کہ تم وہاج حسن آفندی ہو لیکن لوگ نہیں بھول سکتے....'' نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی آواز کافی بلند ہو گئی تھی اور اس کا احساس بھی انھیں وہاج کے چہرے پر برہمی کے آثار دیکھ کر فوراً ہی ہو گیا۔اس سے پہلے کہ وہ اپنے اس شدید رویے کی وضاحت کرتے وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا انٹرنس ڈور کراس کر گیا۔

''وہاج!....'' اسے یوں غصے میں جاتا دیکھ کر انھوں نے اسے پکارا لیکن ان کی آواز انٹرنس ڈور کو زور سے بند کیے جانے کے دھماکے میں دب کر رہ گئی۔

''یہ کیسا شور ہے حسن!'' آوازیں سن کر سلمی بھی کمرے سے نکل آئیں۔

''پتا نہیں یہ لڑکا کیا کرنے والا ہے'' ان کے لہجے میں پریشانی کا عنصر نمایاں تھا۔

''میرا خیال ہے آپ اس کے بارے میں over concious ہو رہے ہیں۔ اس عمر کے بچے freedom چاہتے ہیں اور یہ غلط بھی نہیں۔ ہماری ایڈوائسز اسے انٹرفیئرنس لگتی ہے اسی لیے وہ کبھی کبھی ہا ئپر ہو جاتا ہے..... but there is nothing to worry.....وقت کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا.....اب آپ جلدی سے تیار ہو جاؤ ورنہ آج شام کی پارٹی کے لیے ہم لیٹ ہو جائیں گے'' وہ انھیں تسلی دیتی واپس کمرے میں چلی گئیں۔

''جو میں دیکھ سکتا ہوں وہ تم نہیں دیکھ پا رہی ہو سلمی! .....'' ان کی پیشانی پر شکنوں کا ایک جال سا بن گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہاج ریموٹ ہاتھ میں لیے مسلسل کمرے میں ٹہل رہا تھا اور ٹی وی کے چینلز ایک کے بعد ایک بدلتے جا رہے تھے۔ ہر چینل کے ساتھ ہی اس کے چہرے کا زاویہ مزید بگڑ جاتا۔ آخر تنگ آ کر اس نے ٹی وی آف کیا اور ریموٹ بیڈ پر اچھال دیا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کی آواز سن کر بے اختیار ہی اس کے چہرے پر جوش کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

'' یس کم ان'' اس نے اپنے مخصوص سخت لہجے میں کہا تو بوڑھے شرفو بابا گرم دودھ کا گلاس ہاتھ میں پکڑے اندر چلے آئے۔ گھر کے تمام نوکروں میں سے ایک شرفو بابا ہی تھے جنھیں اس نے اپنے کمرے میں آنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ وہی اپنی نگرانی میں اس کے کمرے کی صفائی وغیرہ بھی کروایا کرتے تھے، ورنہ باقی سب نوکر تو اس کے غصیلے مزاج سے بہت ڈرتے تھے۔ ایک تو ویسے ہی وہ گھر میں بہت کم رہتا تھا اور جب گھر میں موجود ہوتا تو سب پوری کوشش کرتے کہ اس سے ان کا سامنا نہ ہو۔

''اور کچھ چاہیے بیٹا!'' شرفو بابا نے دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے ہمیشہ کی طرح پوچھا۔

'' نہیں.....میں اب سونے لگا ہوں اور سب سے کہہ دیں کہ مجھے کسی بھی وجہ سے ڈسٹرب نہ کیا جائے.....کسی بھی وجہ سے.....'' اس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

'' جی بہتر'' شرفو بابا نے حیرانی سے اسے دیکھا کہ آخر اسے آج اس تاکید کی ضرورت کیوں پیش آئی لیکن سوال کرنے کی نہ تو انھیں اجازت تھی اور نہ جرأت ہی۔ اس لیے خاموشی سے کمرے سے چلے گئے۔

ان کے کمرے سے نکلتے ہی وہاج نے دروازہ لاک کیا پھر جیب سے ایک شیشی نکال کر اس کی ساری ٹیبلٹس دودھ کے گلاس میں انڈیل دیں۔ چمچ سے اچھی طرح ملانے کے بعد

جب اسے یقین ہو گیا کہ ساری گولیاں دودھ میں مل چکی ہیں تو اس نے چمچ پلیٹ میں رکھا اور گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ دودھ نیم گرم تھا اور اس کا ذائقہ بھی کچھ عجیب سا تھا پھر بھی وہ اُسے ایک ہی سانس میں پی گیا۔ خالی گلاس واپس پلیٹ میں رکھ کر اس نے خالی شیشی اٹھائی اور اسے کمرے کے کارنر میں رکھے ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ اب وہ کافی مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔ واپس بیڈ پر آ کر اس نے ٹی وی آن کیا، اس پر MTV چینل سیٹ کیا، ریموٹ سائیڈ پر اچھال دیا اور خود بیڈ کے سرہانے سے ٹیک لگائے چینل پر چلتے انگلش میوزک کا مزہ لینے لگا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد نیند اس پر حاوی ہونے لگی۔ اس نے آنکھیں کھلی رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کے اعصاب بہت تیزی سے سن ہوتے جا رہے تھے۔ ڈوبتے ہوئے حواس میں آخری آواز جو اس کے کانوں سے ٹکرائی وہ اس کے موبائل کے بجنے کی تھی اور پھر دماغ کسی کیمرے کے شٹر کی طرح بند ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

حسن آفندی اور سلمیٰ حسن حیران رہ گئے تھے۔ وہ دونوں تو یہ سوچ سوچ کر بے حال ہوئے جا رہے تھے کہ آخر اسے کس چیز کی کمی تھی جو وہ یوں زندگی سے بیزار ہو چکا تھا اور اب تو شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی کہ وہاج کے کمرے میں موجود ڈسٹ بن سے نیند کی گولیوں کی خالی شیشی ملی تھی۔ جسے اب تک وہ محض حادثے سمجھتے آئے تھے وہ اس کی خودکشی کی کوششیں تھیں، یہ جان کر تو ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ہی ختم ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس بار بھی وہ بس اتفاقاً ہی بچ گیا تھا ورنہ اس نے تو خود کو مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ شرفو بابا کو اُس کے کمرے میں سے کچھ لینا تھا، وہاج کے منع کرنے کے باوجود اُنہوں

نے دروازے پر دستک دی تھی مگر جب کئی بار کی دستک کے بعد بھی دروازہ نہیں کھلا تو شرفو بابا نے حسن آفندی کو بتایا۔ پھر دروازے کو توڑ دیا گیا۔ تقدیر کو شاید کچھ اور منظور تھا۔ وہ بچ تو گیا تھا لیکن اس نے گولیاں اتنی زیادہ تعداد میں کھائی تھیں کہ معدہ واش کرنے کے باوجود بھی اس کی حالت ابھی پوری طرح سنبھلی نہیں تھی اس لیے ڈاکٹرز اسے مزید دو تین دن ہاسپٹل میں ہی رکھنے پر زور دے رہے تھے اور حسن آفندی اور سلمی تو اس حد تک اس کے اقدام سے خوفزدہ ہو چکے تھے کہ انھوں نے ایک بار بھی اسے گھر لے جانے کی بات نہیں کی تھی بلکہ فوراً ہی ڈاکٹرز کی بات مان لی تھی۔

ہاسپٹل سے ڈسچارج ہو کر وہ گھر آیا تو حسن آفندی اپنے ایک دوست کے مشورے پر اسے سائیکو انالسٹ کے پاس لے گئے۔ سائیکو انالسٹ کے سامنے بیٹھے اس کا منہ چیونگم چباتے ہوئے تیزی سے چل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی بھی قسم کی گھبراہٹ یا پریشانی کا تاثر نہیں تھا لیکن بیزاریت اس کے ہر انداز سے نمایاں تھی۔

سائیکو انالسٹ چالیس سالہ ایک وجیہہ شخص تھا جو بغور اس لڑکے کا جائزہ لے رہا تھا، جس کی عمر بمشکل اکیس بائیس سال تھی اور وہ چار بار خودکشی کی کوشش کر چکا تھا۔

''تو وہاج! کیا کرتے ہو تم؟'' اس کے چہرے پر نظریں جمائے اس نے پوچھا۔

'' کچھ نہیں.....''

'' اچھا.....لیکن مجھے تو بتایا گیا ہے کہ تم بی۔ایس۔سی آنرز کر رہے ہو'' اس نے دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کیا آپ واقعی سائیکو انالسٹ ہیں'' اس نے چیونگم چباتے چباتے رک کر پوچھا۔

'' یس آف کورس.....کیوں کوئی شک ہے کیا''

''تو پھر آپ وہ پوچھیں جس کے لیے مجھے یہاں لایا گیا ہے.....جو چیزیں آل

ریڈی میری فائل میں موجود ہیں ان کے متعلق سوال پوچھ کر آپ کیوں اپنا اور میرا وقت ضائع کر رہے ہیں'' اس نے اطمینان سے کہا اور دوبارہ چیونگم چبانے میں مصروف ہو گیا۔

اس نے بے اختیار ایک گہرا سانس بھرا تھا۔ اسے یہ ماننے میں کوئی عار نہیں تھی کہ اس کے سامنے بیٹھا یہ نوجوان اس کی دس سالہ پریکٹس میں سب سے مشکل اور بے حد ذہین پیشنٹ تھا۔

''اوکے ایز یو وش.....مرنا کیوں چاہتے ہو تم ؟'' اس نے براہ راست سوال کیا۔

''ابھی اس سوال پر غور کرنا باقی ہے'' وہاج کا اطمینان قابل دید تھا۔

''that,s strange.....یعنی چار بار خودکشی کی کوشش کرنے کے باوجود تم اس کی وجہ نہیں جانتے'' اس نے جتلاتے ہوئے کہا۔

''let me correct you first.....چار نہیں تین بار۔۔۔۔۔۔پہلی بار واقعی حادثہ تھا....''

'' اور تم چاہتے ہو کہ میں اسے سچ مان لوں''

'' نہ مانیں.....مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا....'' اس نے بے فکری سے کہا۔

''اوکے لیو اٹ .....یہ بتاؤ کہ بار بار خودکشی کی کوشش کیوں کرتے ہو'' اس نے اسی سوال کو ذرا مختلف انداز میں پوچھا۔

'' ہوں.....یہ سوال ذرا معقول ہے.....let me see.....ویسے اس سوال کا سیدھا جواب تو یہ ہے کہ I am fed up with my life '' وہاج نے پہلی بار ذرا سوچتے ہوئے جواب دیا تھا تو انالسٹ کے چہرے پر اطمینان پھیلتا چلا گیا کہ اب وہ اسے اپنی راہ پر لانے میں کامیاب ہو رہا تھا۔

'' کیوں .....ظاہر ہے زندگی سے تمھاری یہ بیزاری بلا وجہ تو نہیں ہو سکتی نا ؟'' اس

نے جان بوجھ کر سوال کرنے کے ساتھ اپنی رائے بھی دے دی تا کہ وہ اسے بنا سوچے ردنہ کر سکے۔

''may be '' اس کا انداز جان چھڑانے والا تھا۔

''but I am sure.....تمھارا اکیڈمک کیریئر اتنا شاندار ہے اور پھر تمھارا فیملی بیک گراؤنڈ جس طرح کا ہے، مجھے نہیں لگتا کہ کوئی بھی آسائش تمھاری پہنچ سے دور ہے.....اس کے باوجود بھی اگر تم زندگی سے خوش نہیں ہو تو لازمی کوئی نہ کوئی ٹھوس وجہ تو ہوگی ہی'' اس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''مجھے نہیں پتا کہ ٹھوس وجہ آپ کی نظر میں کیا ہوتی ہے...میں تو بس خوشی ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہوں جو میرے پاس نہیں.....''

'' joy and happiness ''

''خوشی.....اور وہ بھی موت میں.....کیا زندگی کی آسائشیں کم پڑ گئی ہیں جو تم موت میں خوشی تلاش رہے ہو.....اور اگر ایسا ہے بھی تو تم دنیا کے بے وقوف ترین انسان ہو کیوں کہ موت تو نام ہی احساس کا ختم ہو جانا ہے پھر تمھیں خوشی کیسے مل سکتی ہے'' اس نے بڑے ہی ماہرانہ انداز میں اس کی برین واشنگ کرنے کی کوشش کی۔

''یہ بات مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے لیکن پرابلم یہ ہے کہ جب احساس ہی ختم ہو جاتا ہے تو خوشی ملتی ہے یا نہیں، کیسے پتا چل سکتا ہے.....بس یہی چیز مجھے کنفیوژ کر رہی ہے'' مقابل بھی وہاج حسن تھا جو اتنی آسانی سے قابو میں آنے والوں میں سے نہیں تھا۔

''اور جب تک تمھاری یہ کنفیوژن دور نہیں ہو جاتی تم خودکشی کی کوششیں جاری رکھو گے'' اس کے جواب سے اس نے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے پوچھا۔

''خاصے ذہین ہیں آپ'' اس نے سراہتے ہوئے کہا۔

''ذہین تو تم بھی ہو.....فرق صرف اتنا ہے کہ تم اپنی ذہانت کا غلط استعمال کر رہے ہو'' اس نے ایک اور کوشش کی۔

'' رئیلی.....نئی اطلاع ہے....'' اس نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا لیکن وہ نظر انداز کر گیا۔

''lookوہاج!.....زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اسے یوں ضائع مت کرو.....اگر تمھیں جینے کے اتنے مواقع مل چکے ہیں تو ضروری نہیں کہ اگلی بار بھی ایسا ہی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ تم یہاں سے قدم باہر نکالو اور اگلے ہی موڑ پر موت تمھاری منتظر ہو یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آگے ایک طویل زندگی تمھارا انتظار کر رہی ہو.....خوشی ڈھونڈنے سے نہیں ملتی اور جیسے تم ڈھونڈ رہے ہو ویسے تو بالکل بھی نہیں۔ کسی دوسرے کو خوشی دے کر ہی ہم خوشی پا سکتے ہیں اگر واقعی تم سچی خوشی پانا چاہتے ہو تو.....آج کا سیشن ہم یہیں ختم کرتے ہیں۔ باقی باتیں ہم اگلی سٹنگ میں کریں گے'' وہاج کے چہرے پر بیزاری کے آثار دیکھ کر اس نے اپنی بات جلدی سے سمیٹ دی۔

'' وٹ.....ابھی اگلی سٹنگ باقی ہے؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

'' یہ سٹنگز تو ابھی چلیں گی جب تک کہ میں تمھیں یا تم مجھے قائل نہیں کر لیتے'' اس نے خوشدلی سے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ منہ بناتا اس کے کیبن سے باہر نکل گیا۔

وہاج کے جاتے ہی اس نے حسن آفندی کو اپنے کیبن میں بلا لیا۔

'' مجھے کافی سٹنگز کرنی پڑیں گی وہاج کے ساتھ.....ڈیٹس آپ میری سیکرٹری سے لے لیجیے گا.....فی الحال صرف اتنا کہوں گا کہ آپ اسے وقت دیں۔ کوشش کر کے ہر روز کچھ گھنٹے اس کے ساتھ گزاریں، اسے احساس دلائیں کہ آپ کو اس کی پروا ہے۔ کیوں کہ ایسی حرکتیں عموماً بچے اپنے پیرنٹس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے بھی کیا کرتے ہیں'' اس نے

انتہائی سنجیدگی سے انھیں بریف کیا تو وہ شکریہ ادا کر کے چلے آئے۔

☆ ☆ ☆

پچھلے چھ ہفتوں سے حالات کافی پرسکون جا رہے تھے۔ سائیکوانالسٹ کے ساتھ وہاج کے اب تک چار سیشن ہو چکے تھے اور چوتھے سیشن کے بعد سے تو اس میں کافی تبدیلیاں نظر آ رہی تھیں۔ اب وہ زیادہ تر یا تو سوچوں میں گم رہتا یا پھر خود سے ہی الجھتا نظر آتا۔

کزن کی منگنی کا فنکشن اٹینڈ کرنے کے لیے سلمی نے جب وہاج کو اپنے ساتھ اسلام آباد چلنے کو کہا تو تھوڑی سی پس وپیش کے بعد وہ مان گیا۔ حالانکہ وہ فیملی گیدرنگ سے ہمیشہ گھبراتا تھا لیکن اس بار اس کے اتنی جلدی مان جانے پر وہ حیران بھی تھیں اور خوش بھی۔ وہ دونوں کل شام ہی اسلام آباد پہنچے تھے۔ فنکشن آج تھا لیکن آج صبح آنے والے زلزلے نے سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ مارگلہ ٹاور کے جو بلاک زلزلے سے متاثر ہوئے تھے ان میں کچھ relatives اور فیملی فرینڈز بھی زخمی ہو گئے تھے۔ اس لیے فنکشن فی الحال postpone کر دیا گیا تھا۔ اور صبح سے ہر نیوز چینل آج زلزلے کو ہی ہائی لائٹ کر رہا تھا، خاص طور پر ملک کے شمالی علاقے۔ اور وہاں کی جو حالت تھی وہ دیکھ دیکھ کر وہاج کو وحشت ہونے لگی تھی۔ وہ موت میں ہمیشہ خوشی تلاش کرتا آیا تھا لیکن اتنا عبرت ناک انجام دیکھ کر اسے عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ اسی لیے وہ بغیر کسی کو بتائے کزن کی گاڑی لیکر باہر نکل آیا۔ اس کا خیال تھا کہ باہر کھلی فضا میں آ کر وہ ان مناظر کو بھول پائے گا اور اس کی بے چینی بھی دور ہو جائے گی لیکن

یہ اس کی خام خیالی تھی کیوں کہ ڈرائیو کرتے ہوئے بھی بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے وہی مناظر آ رہے تھے۔کبھی کوئی ٹوٹا ہوا گھر.....روتا ہوا بچہ.....وحشت زدہ عورتیں.....بے بس مرد.....اس کے کانوں میں مسلسل آوازیں گونج رہی تھیں۔اچانک ایک سائیڈ سے، بھاگتا ہوا ایک نوجوان اس کی گاڑی کے سامنے آ گیا۔اسے بچانے کے لیے اس نے بڑی مہارت سے سٹیئرنگ بائیں طرف گھمایا لیکن پھر بھی کار کا بمپر اس کی دائیں ٹانگ سے ٹکرایا اور وہ اچھل کر دور جا گرا۔خدا کا شکر کہ اس روڈ پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔اس لیے کوئی بڑا حادثہ ہونے سے بچ گیا۔گاڑی کے بریک کچھ دیر تک چرچرائے اور وہ فرنٹ ڈور کھول کر تقریباً بھاگتے ہوئے اس نوجوان کے پاس آیا۔ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ زخمی وہ خود نہیں بلکہ کوئی اور تھا۔اس کی دائیں ٹانگ خون میں لت پت تھی لیکن وہ سانسیں لے رہا تھا۔اس نے اپنے بازوؤں میں اسے اٹھایا تو اسے کچھ عجیب سی فیلنگ ہوئی جسے وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھا لیکن اس وقت موقع ایسا تھا کہ اس نے سر جھٹکا اور اسے لا کر کار کی پچھلی نشست پر لٹا دیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔اس نے نظریں گھما کر پیچھے اس پر ایک نظر ڈالی اور پھر گاڑی سٹارٹ کر کے اس کا رخ ہاسپٹل کی طرف موڑ دیا۔

وہاج ہاسپٹل کے کوریڈور میں کھڑا خود پر حیران ہو رہا تھا کہ وہ نہ صرف اس زخمی نوجوان کو ہاسپٹل تک لے آیا تھا بلکہ اب تک یہاں موجود بھی تھا۔اپنے اندر آنے والی اس اچانک تبدیلی نے کسی حد تک اسے الجھا بھی دیا تھا۔اچانک ڈاکٹر نے آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک اٹھا۔

''پریشانی والی کوئی بات نہیں۔چوٹیں معمولی نوعیت کی تھیں ہم نے بینڈج کر دی ہے۔صرف ٹھائی پر بمپر لگنے کی وجہ سے ماس پھٹ گیا تھا تو ہمیں سٹیچز لگانے پڑے۔اب

آپ انھیں گھر لے جا سکتے ہیں''

ڈاکٹر اس کے کندھے پر تھپکی دیتا آگے بڑھ گیا اور وہ خود بڑے ہی نپے تلے قدم اٹھاتا اس کمرے کی طرف بڑھنے لگا جہاں سے ابھی ابھی ڈاکٹر باہر نکلا تھا۔

کمرے کے اندر جانے کے لیے ابھی اس نے ہینڈل لاک پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ دروازہ خود بخود کھلتا چلا گیا اور اس کے سامنے وہی نوجوان دروازہ پکڑے کھڑا تھا۔اس کی چوٹیں اگر شدید نوعیت کی نہیں تھیں تو اتنی معمولی بھی نہیں تھیں کہ وہ بنا سہارے کے آرام سے کھڑا رہ پاتا۔

''ہیں....تم یہاں کیا کر رہے ہو.....'' وہاج نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے کندھے پر رکھ لیا۔

''مجھے جانا ہے.....فوراً.....میرے گھر والے نجانے کس حال میں ہونگے''

اس نے اتنے بکھرے ہوئے لہجے میں کہا کہ وہ چونک اٹھا۔اس وقت اس کی جو حالت تھی اس میں اپنے علاوہ کسی اور کے بارے میں اس کی فکر مندی وہاج کو حیران کر رہی تھی۔وہ خود بھی ایسی ہی کنڈیشن سے کتنی بار گزر چکا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات اس کے لیے نا قابل فہم تھے۔

''ٹھیک ہے.....میں تمھیں تمھارے گھر تک ڈراپ کر دیتا ہوں'' وہ سر جھٹک کر اسے سہارا دیئے گاڑی تک لے آیا۔پھر فرنٹ سیٹ پر اسے بٹھا کر خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

''تمھیں جانا کہاں ہے؟'' گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے مین روڈ پر آ کر اس نے پوچھا۔

'' بس سٹینڈ..... بارہ بجے کی بس ہے میری.....پلیز مجھے جلدی سے وہاں پہنچا دو'' نوجوان نے بڑے ہی عجلت بھرے انداز میں کہا۔

''بس سٹینڈ۔میں سمجھا نہیں.....ابھی تو تم اپنے گھر والوں کے لیے پریشان تھے اور

اب.....'' وہاج نے الجھ کر اسے دیکھا جواب ہولے ہولے کچھ بڑ بڑا رہا تھا لیکن اس کی آواز اتنی ہلکی تھی کہ وہ کچھ سن ہی نہیں پایا۔اس کی اس عجیب وغریب حالت نے وہاج کو اور بھی الجھا دیا۔اس نے گاڑی سائیڈ پر روک کر اس کے کندھے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈالا تو وہ چونک اٹھا۔

''کیا پہنچ گئے؟'' اس نے بڑی ہی بے تابی سے کار سے باہر نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں.....لیکن میں تمھیں سمجھ نہیں پا رہا ہوں.....تمھارا behaviour کچھ عجیب سا ہے''

''اس وقت میں تمھیں کچھ نہیں سمجھا سکتا دوست!.....میرے پاس وقت بالکل نہیں۔بس تم مجھے بس سٹینڈ پہنچا دو.....'' اس کا لہجہ آخر میں کچھ التجائیہ ہو گیا۔

''پہنچا تو دوں لیکن کیا تمھیں لگتا ہے کہ بارہ بجے والی بس اب تک تمھارے انتظار میں رکی ہوئی ہوگی'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔

''کیا مطلب؟''اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں لہراتے ڈر اور خوف کے سائے وہاج کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکے۔

''اس وقت ایک بج رہا ہے'' اس نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''اوہ.....یہ کیا ہو گیا.....اب میں کیا کروں.....اس ٹانگ کو بھی ابھی زخمی ہونا تھا'' پریشانی وغصے کی ملی جلی کیفیت میں گھر کر اس نے زور سے اپنی زخمی ٹانگ پر ہاتھ مارا جس سے درد کی ایک تیز لہر اس کے پورے بدن میں دوڑ گئی اور وہ کراہ کر رہ گیا۔

''ارے۔یہ کیا کر رہے ہو.....سٹیچز کھل جائیں گے'' وہاج نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''یہاں کئی زندگیاں داؤ پر لگی ہیں اور تم ان معمولی سٹیچز کے لیے پریشان ہو رہے ہو'' اس نے اپنا ہاتھ کھینچ کر طنزیہ انداز میں کہا۔اس اچانک پڑنے والی آفت نے اسے تھوڑا ہائپر کر دیا تھا ورنہ شکل سے وہ بہت دھیمے مزاج کا انسان لگ رہا تھا۔

وہاج نے بہت غور سے اسے دیکھا تھا۔وہ تقریباً اسی کا ہم عمر تھا لیکن اس کی ذہنی حالت اس کو پہنچنے والے کسی بہت بڑے صدمے کی غماز تھی۔اس کی آنکھوں میں درد کا اتنا گہرا تاثر تھا کہ بہت دیر تک وہ اس کی آنکھوں پر سے اپنی نظریں ہٹا نہیں پایا۔

''دیکھو.....اگر تم مجھے اپنی پرابلم بتاؤ تو شاید میں تمھاری کچھ مدد کر سکوں.....'' کچھ دیر بعد جب وہ بولا تو اپنے ہی لفظوں پر اسے جی بھر کر حیرانی ہوئی تھی۔پتا نہیں یہ ہمدردی تھی یا ندامت یا شاید تھوڑی دیر پہلے وہ جس جذباتی کیفیت سے گزر رہا تھا یہ اسی کا اثر تھا۔ بہر حال جو بھی تھا، یہ لمحہ وہاج حسن کی زندگی کا سب سے عجیب وغریب لمحہ تھا۔

''ہاں.....تم میری مدد کر سکتے ہو.....مجھے مظفر آباد پہنچا دو کسی بھی طرح.....میری فیملی.....پتا نہیں وہ سب کس حال میں ہوں گے.....

کاش میں رکا نہ ہوتا۔ہمیشہ کی طرح فرائی ڈے کو ہی چلا گیا ہوتا.....لیکن نہیں...مجھے تو یونیورسٹی، دوست ، پارٹی .....یہ سب گھر والوں سے زیادہ پیارے تھے نا.....یہ زلزلہ.....'' وہ خود پر غصہ نکال رہا تھا۔اس کی ہر بات ادھوری ہوتے ہوئے بھی مکمل تھی۔

مظفر آباد کا نام سن کر وہاج ساری صورتحال سمجھ گیا تھا۔اب وہ اس کی ذہنی کیفیت کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ پا رہا تھا۔ٹی وی پر جو کچھ دیکھ کر وہ وحشت کا شکار ہوا تھا، وہ اس کے لیے ایک live show سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔اس زلزلے میں اس نے کسی اپنے کو نہیں کھویا تھا لیکن اس کے باوجود زلزلے سے ہونے والی تباہی دیکھ کر وہ اندر سے ہل کر رہ گیا تھا جبکہ اس کے ساتھ بیٹھا یہ نوجوان شاید اس تباہی میں بہت کچھ کھو چکا تھا یا پھر

کھونے والا تھا۔لیکن جو چیز وہاج کو hit کر رہی تھی وہ اس کی آنکھوں میں موجود ڈر تھا.....کسی اپنے کو کھو دینے کا ڈر.....اچانک اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ ان آنکھوں سے ڈر کا یہ تاثر مٹا دے اور ان میں خوشی اور مسکراہٹ بھر دے.....بس ایک پل....اور فیصلہ ہو گیا....جس احساس سے گھبرا کر وہ بھاگنا چاہ رہا تھا اس نے پوری طرح سے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

''میں تمھیں لیکر جاؤ نگا وہاں.....''اس نے مطمئن سے انداز میں کہا اور گاڑی سٹارٹ کر دی۔ اس نوجوان نے کسی قدر حیرانی سے اسے دیکھا لیکن اس کے چہرے پر پھیلا اطمینان دیکھ کر اس نے خاموشی سے سیٹ کی بیک سے سر ٹکا دیا۔

اب اس کے چہرے پر بھی ہلکا سا اطمینان نظر آ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

سفر کئی گھنٹوں کا تھا لیکن ابھی اس نے آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔اس نے جیب سے موبائل نکال کر دیکھا تو اس پر مام کا نام بلنک کر رہا تھا۔شاید اس کی اتنی لمبی غیر حاضری نے انھیں پریشان کر دیا تھا۔

''یس مام!''اس نے ایک ہاتھ سے سٹیئرنگ تھاما اور دوسرے ہاتھ سے موبائل آن کر کے کان سے لگا لیا۔

'' وہاج!.....کہاں ہو تم.....کچھ بتا کر بھی نہیں گئے..... پتا ہے میں کتنا پریشان ہو رہی تھی''دوسری طرف سے ان کی پریشان سی آواز سنائی دی۔

''take it easy مام!.....میں ٹھیک ہوں.....ایک ضروری کام سے جا رہا

ہوں.....کل تک واپس آجاؤنگا''

''وٹ.....آر یو میڈ وہاج!.....یہاں کیا حالات ہیں اورتم.....میں کچھ نہیں جانتی۔اگلے ایک گھنٹے تک میں تمھیں گھر میں دیکھنا چاہتی ہوں''ان کا لہجہ حیرت کے ساتھ ساتھ تحکم سے بھرپور تھا۔

''مام!I can't come .....ویسے بھی میں قدم بڑھا چکا ہوں اوراب واپس آنا حماقت ہوگی'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''تم آخر ہو کہاں.....اور کیا کرنے جارہے ہو'' اس کی سنجیدگی نے انھیں ڈرادیا تھا اور یہ ان کے لہجے سے صاف ظاہر تھا۔

''ڈونٹ وری مام!میں کچھ غلط نہیں کرنے جارہا ہوں.....اب تک میں خود کو آزماتا آیا ہوں لیکن آج میں یہ موقع زندگی کو دینا چاہتا ہوں.....حالانکہ اب تک میں ٹھیک سے کچھ طے نہیں کرپایا ہوں۔بس دیکھنا چاہتا ہوں کہ جولوگ خود کو لہروں کے سپرد کردیتے ہیں ان کا انجام کیا ہوتا ہے.....کیوں کہ لہروں کے مخالف جاکے تو میں نے دیکھ لیا ہے۔اس لیے اب.....'' اس کا طمینان قابل دید تھا اور دوسری طرف سے وہ چیخ اٹھیں۔

''سٹاپ دس نان سینس وہاج!.....یہ آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے....کیوں مجھے پریشان کر رہے ہو۔پلیز گھر آجاؤ'' بولتے بولتے آخر میں ان کی آواز رندھ گئی۔

''بلیومی مام!.....میں یہ سب آپ کو پریشان کرنے کے لیے نہیں کررہا ہوں''اس نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''تو پھر!''

''I don't know why لیکن مجھے ایسی فیلنگ ہورہی ہے جیسے یہ سفر میری زندگی میں کوئی بہت بڑی تبدیلی لانے والا ہے.....کچھ ہے جو مجھے اپنی طرف کھینچ رہا

ہے اور وہ کچھ کیا ہے .....یہ میرے لیے جاننا بہت ضروری ہے۔ ..... please try to understand me'' اس نے اتنے مدلل انداز میں اپنا نقطہ نظر پیش کیا کہ کچھ دیر کے لیے دوسری طرف بالکل خاموشی چھا گئی۔

'' پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو.....میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا.....ٹھیک ہے جیسے تمھاری مرضی.....لیکن اپنا خیال رکھنا'' کچھ دیر کے بعد ان کی بکھری ہوئی آواز سنائی دی۔

''I will'' اس نے کہا اور موبائل آف کر کے واپس جیب میں رکھ لیا۔ یونہی اس نے ایک نظر ساتھ بیٹھے اس نوجوان پر ڈالی جس کی آنکھیں بند تھیں لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے اندیشوں اور واہموں کو دور کرنے کے لیے ماضی کے خوبصورت لمحوں کو یاد کر رہا ہے۔

☆ ☆ ☆

وہ مظفر آباد پہنچے تو شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ وہ ایک طویل اور تھکا دینے والا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچے تھے لیکن جس قیامت کے آثار وہ راستے میں دیکھتے آئے تھے، وہ کس طرح قہر بن کر ٹوٹی تھی اس کا صحیح اندازہ اسے اب ہو رہا تھا۔

نوجوان کی بتائی ہوئی جگہ پر وہاج نے گاڑی روکی تو وہ بڑی بے تابی سے دروازہ کھول کر اترا۔ ایک پل کے لیے اس کے قدم ڈگمگائے لیکن اس نے دروازے کا سہارا لے لیا اور پھر ایک عزم کے ساتھ وہ لنگڑاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ وہاج نے اسے آواز دینا چاہا لیکن یہ سوچ کر وہ حیران رہ گیا کہ جس کا درد محسوس کر کے وہ یہاں تک چلا آیا تھا وہ اس کا نام بھی نہیں جانتا.....وہ اسی سوچ میں غلطاں گاڑی سے اتر گیا۔ وہ اس کے پیچھے

جانا چاہتا تھا لیکن اس کے قدم جیسے جم کر رہ گئے تھے۔ چاروں طرف ایک سا ہی منظر تھا۔ گھر تو کوئی تھا ہی نہیں..... بس آثار بچے تھے جن پر گھر ہونے کا گمان کیا جا سکتا تھا۔ زندگی کی اتنی ہولناک تصویر اس نے پہلی بار دیکھی تھی اور کانپ کر رہ گیا۔ اچانک اسے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ اس نے چونک کر دائیں طرف دیکھا تو ایک دو سالہ بچہ ملبے تلے دبی کالی چادر پر ہاتھ مار مار کر رو رہا تھا۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا اور اس کے قدم بے اختیار اس بچے کی طرف اٹھتے چلے گئے۔ بچے کو گود میں اٹھانے کے لیے جھکا تو چادر سے باہر نکلے نسوانی ہاتھ پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے چادر ہٹائی تو بس ہاتھ ہی ملبے سے باہر نظر آ رہا تھا۔ اس نے اندازے سے اپنے ہاتھوں کی مدد سے جلدی جلدی مٹی ہٹائی تو تھوڑی سی کوشش کے بعد اس عورت کا چہرہ بھی ملبے سے باہر آ گیا۔ اس نے فوراً ہی اس کی سانسیں محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ موت کے بے رحم شکنجے نے ایک معصوم کی جان لے لی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کے حواس معطل ہو رہے تھے۔ بچہ ابھی تک رو رہا تھا۔ اس نے بچے کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگایا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کا پورا جسم ہولے ہولے لرز رہا ہے۔ موت کتنی بے رحم ہوتی ہے اس کا اندازہ اسے بخوبی ہو رہا تھا۔ بچہ اب بھی روئے چلے جا رہا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ تب اس کی نظر ایک اور خاتون پر پڑی۔ اس کے آس پاس لوگ ادھر سے ادھر بھاگتے پھر رہے تھے لیکن وہ تو جیسے ہوش و خرد سے بیگانہ ہو چکی تھی. بس پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اپنے سامنے بے حس و حرکت پڑے بچے کو دیکھے جا رہی تھی۔ وہاج نے ایک پل کے لیے سوچا اور پھر اس روتے ہوئے بچے کو لے جا کر اسی بچے کے پہلو میں بٹھا دیا اور خود اس سے ذرا فاصلے پر کھڑے ہو کر دیکھنے لگا۔ بچہ مسلسل رو رہا تھا لیکن اس عورت نے اب تک اس پر کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔ آخر بچہ گھٹنوں کے بل چل کر اس عورت کے

پاس گیا اور اس کی چادر پکڑ کر کھینچنے لگا۔ روتے ہوئے بچے نے جب اس عورت کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارا تو جیسے اس بے جان وجود میں جان آ گئی۔ بچے کو یوں بلکتا دیکھ کر ممتا تڑپ اٹھی اور اس نے بچے کو سینے سے لگا لیا۔

اب وہ آہستہ آہستہ اسے تھپک رہی تھی اور بچے کا رونا بھی اب ہلکی ہلکی ہچکیوں میں بدل چکا تھا۔ وہ خاموشی سے وہاں سے ہٹ گیا اور بھاری قدموں سے چلتا ہوا اپنی گاڑی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ چاروں طرف دوڑائی.....اسے لگا کہ اب وہ یہاں سے واپس نہیں جا پائے گا۔ اس زمین نے اس کے قدموں کو زنجیر کر لیا ہے.... اندھیرا گہرا ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی لوگوں کی دم توڑتی امیدیں ان کے بے بس چہروں پر لکھی صاف نظر آ رہی تھیں۔ اس نے ایک گہرا سانس خارج کیا اور سوچوں میں گھرا گاڑی کی پچھلی نشست پر دراز ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

صبح کی روشنی نمودار ہوتے ہی وہ اٹھ گیا حالانکہ ساری رات اس کی جاگتے ہوئے گزری تھی۔ یہاں جو کچھ اس نے دیکھا تھا اس کے بعد تو سو جانے کا تصور ہی محال تھا لیکن اس کے لیے یہ رات خود احتسابی کی رات تھی۔ شاید اسی لیے ساری رات جاگنے کے باوجود نیند کا ہلکا سا شائبہ بھی اس کی آنکھوں میں موجود نہ تھا۔ روشنی کی ایک کرن گھپ اندھیرے کا دامن کیسے چیر دیتی ہے، یہ وہ آج ہی جان پایا تھا اور وہ بھی اس لیے کہ اس کے اپنے اندر کے اندھیرے کو آگہی کی روشنی مل گئی تھی۔ صبح کی روشنی پوری طرح پھیلنے کے بعد لوگ پھر سے کوششوں میں لگ گئے تھے کہ شاید کسی کو ان قبروں میں زندہ دفن ہونے سے بچا

سکیں۔ کچھ امدادی ٹیمیں بھی یہاں آ کر کام کر رہی تھیں۔ وہ بھی ان میں سے ایک ٹیم کے ساتھ شامل ہو گیا۔ ان لوگوں کی پہلی ترجیح یہی تھی کہ اگر کوئی ملبے کے نیچے اب بھی سانسیں لے رہا ہے تو اسے نکال پائیں اور جو زخمی ہوئے ہیں انھیں میڈیکل کیمپ تک پہنچایا جائے۔ وہاج بھی ان لوگوں کے ساتھ پوری تندہی سے اپنی کوششوں میں لگا ہوا تھا اور شام تک ان کی ٹیم آٹھ نو لوگوں کو ملبے سے نکال چکی تھی۔ ان میں سے کچھ تو خاصے زخمی تھے جنھیں وہاج نے خود میڈیکل کیمپ تک پہنچایا تھا جبکہ دو بچوں کو بہت ہی معمولی چوٹیں آئی تھیں حالانکہ ملبے کے اندر جس پوزیشن میں وہ تھے اس میں ان کا بچ جانا ایک معجزہ ہی تھا مگر جسے اللہ رکھے.....

وہاج اور اس کی ٹیم ایک گھر کا ملبہ ہٹا رہے تھے کہ انھیں ہلکی ہلکی سسکیاں سنائی دیں۔ ان سب نے اپنے اپنے ہاتھ روک لیے اور بہت غور سے آواز کی سمت کا اندازہ لگانے لگے۔ آواز پچھلی سمت سے آ رہی تھی۔ وہ سب گھوم کر پیچھے چلے گئے۔ گھر کی پچھلی دیوار پوری طرح گری نہیں تھی بلکہ اب بھی آدھی دیوار قائم تھی اور اسی وجہ سے چھت آگے کی طرف سے تو پوری زمین پر آ گری تھی جبکہ پیچھے اس دیوار کے سہارے ٹکی تھی۔ سسکیوں کی آواز اب ذرا تیز ہو گئی تھی۔

''اندر کوئی ہے.....اندر کوئی ہے.....'' وہاج نے زور زور سے آوازیں دینی شروع کر دیں۔

''با... با..... با.... با.....'' کچھ دیر بعد بھرائی ہوئی آواز میں کچھ ٹوٹے پھوٹے لفظ انھیں سنائی دیئے تھے۔ بچے کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ بمشکل سات آٹھ سال کا ہے اور پچھلے تیس گھنٹوں سے اندر بند ہونے کی وجہ سے بہت خوفزدہ ہے۔

''بچہ کافی چھوٹا ہے اور ڈرا ہوا بھی لگ رہا ہے۔۔۔۔۔۔ مجھے اندر جانا پڑے گا''

وہاج نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''اندر جانا خطرناک ہوسکتا ہے'' امدادی ٹیم میں سے ایک لڑکے نے کہا۔

''رسک تو لینا پڑے گا.....'' وہاج نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو وہ سب اندر جانے کے لیے راستہ بنانے لگے۔ان کی پوری کوشش تھی کہ ملبہ اس طرح ہٹایا جائے کہ دیوار کو کوئی نقصان نہ پہنچے کیوں کہ چھت کو اسی دیوار کا سہارا تھا اور اندر کی صورتحال سے وہ اب تک لاعلم تھے۔کافی تگ و دو کے بعد آخر وہ اتنا راستہ بنا لینے میں کامیاب ہو گئے کہ ایک آدمی سینے کے بل گھسٹ کر اندر داخل ہو جائے۔

''ایک بار پھر سوچ لو'' اسی لڑکے نے دوبارہ اسے خطرے سے آگاہ کرنا چاہا۔

''میں نے زندگی میں زیادہ تر کام بنا سوچے ہی کیے ہیں.....'' اس نے دھیمے سے مسکراتے ہوئے کہا اور ایک نظر آسمان پر ڈال کر سینے کے بل گھسٹتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔

بچہ دیوار کے قریب ہی سکڑا سمٹا بیٹھا تھا۔اندھیرے کے باوجود وہ اس بچے کی آنکھوں میں منجمد خوف دیکھ چکا تھا۔اس نے دیوار کے سہارے بیٹھ کر بچے کو اپنے سینے سے لگا لیا تا کہ اس کا ڈر کچھ کم ہو جائے ورنہ بچے کے چہرے پر پھیلی وحشت دیکھ کر اسے یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں اس کا ہارٹ فیل ہی نہ ہو جائے۔اس کی دھڑکنیں کچھ تھمیں تو اس نے اسے crawling کراتے اسی راستے سے باہر بھیج دیا۔

''وہاج!.....بچہ صحیح سلامت پہنچ گیا ہے۔اب تم بھی باہر آ جاؤ'' اسی لڑکے کی آواز اسے دوبارہ سنائی دی جو اسے اندر آنے سے روک رہا تھا۔

بچے کے صحیح سلامت باہر پہنچنے کا سن کر اس کے اندر اطمینان پھیل گیا۔پھر وہ جیسے ہی دیوار سے ہٹ کر اس سرنگ نما راستے کی طرف بڑھا اچانک زلزلے کا ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔کمزور دیوار یہ ہلکا سا جھٹکا بھی نہ سہہ سکی اور زمین بوس ہو گئی۔اس کے گرتے ہی چھت

اس کے اوپر آ گری۔ درد کی ایک تیز لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی جس نے اس کے ڈوبتے ہوئے ذہن کو پھر سے بیدار کر دیا۔ اس کا پورا دھڑ چھت کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اس لیے وہ کوشش کے باوجود ایک انچ بھی حرکت نہ کر پایا۔ اس کے سر میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے اپنے سر پر ہاتھ لگایا تو اسے کچھ نمی سی محسوس ہوئی اور پھر کانوں کے قریب سے بہتا خون بھی اسے محسوس ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ رینگ گئی۔

''وہاج.....وہاج.....'' اپنے نام کی پکار اسے صاف سنائی دے رہی تھی لیکن اس کی اپنی آواز جیسے حلق میں ہی اٹک کر رہ گئی تھی۔

.....مام.....ڈیڈ.....میں.....'' اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ باہر سے آنے والی آوازیں بھی اب مدھم پڑنے لگی تھیں۔ اور.....

پھر موت جیت گئی۔ موت کا تعاقب آج اپنے اختتام کو پہنچ گیا تھا، موت اپنے شکار کو گھیر گھار کر وہیں لے آئی تھی جہاں اُسے آنا تھا۔

☆ ☆ ☆

بساطِ دہر

''فرزام!.....آئی ایم سوری لیکن میں آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔آپ پلیز یہ منگنی توڑ دیں.....میرے گھر والے میری بات نہیں مان رہے لیکن کم از کم آپ تو یہ قدم اٹھا سکتے ہیں اور اس میں ہم دونوں کا ہی فائدہ ہے ''

میری منگنی فضہ کے ساتھ پچھلے ہفتے ہوئی تھی اور ساتھ ہی دو مہینے بعد کی شادی کی ڈیٹ بھی فائنل کر دی گئی تھی۔میں اپنی منگیتر کو لنچ کرانے آج پہلی بار لایا تھا تا کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ اکیلے میں کچھ وقت گزار کر ایک دوسرے کو کچھ نہ کچھ سمجھ لیں۔ہم دونوں کا فیملی بیک گراؤنڈ ایک سا تھا۔دونوں کا تعلق اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانوں سے تھا اور مجھے لگتا تھا کہ ہم دونوں کی اچھی نبھے گی لیکن آج فضہ کی باتوں نے مجھے حیران کر دیا تھا۔

''لیکن فضہ!.....شادی سے انکار کی کوئی وجہ تو ہو گی؟'' میں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

''آئی ایم شاکڈ مسٹر فرزام کہ یہ بات آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں.....مجھے تو لگا تھا کہ آپ سمجھ جائیں گے.....'' اس نے اتنی حیرانی سے کہا کہ میں کسی قدر چڑ گیا۔

''جب تک آپ بتائیں گی نہیں تو میں سمجھوں گا کیسے''

''اگر آپ صاف صاف لفظوں میں سننا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے.....میرا آئیڈیل کوئی بہت خوبصورت سا شخص ہے جب کہ آپ.....sorry to say آپ جیسے عام شکل وصورت کے انسان کے ساتھ میں شادی نہیں کر سکتی ..... we don't match with each other اور کمپرومائز کرنا تو میں نے سیکھا ہی نہیں.....آئی ہوپ اب تو آپ سمجھ ہی گئے ہونگے.....''

اس نے ایک طنزیہ نظر مجھ پر ڈالی اور چلی گئی۔ میں حیرت سے بت بنا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ کتنی آسانی سے وہ میری شخصیت کے پرخچے اڑا کر چلی گئی تھی اور میں بس گم صم ہی بیٹھا رہ گیا تھا۔

گھر واپس آ کر میں نے اپنا سارا غصہ کمرے کی چیزوں کو توڑ پھوڑ کر نکالا تھا۔ پورے کمرے کا حشر نشر کرنے کے بعد جب غصہ ذرا کم ہوا تو میں نے تھکے سے انداز میں خود کو بیڈ پر گرا لیا۔ ایسا نہیں تھا کہ میں ہمیشہ ہی غصے میں آ کر اپنے کمرے کی چیزوں کو توڑا پھوڑا کرتا تھا بلکہ میں تو بہت دھیمے مزاج کا انسان تھا اور مجھے غصہ بھی بہت کم آتا تھا لیکن پچھلے ایک ڈیڑھ سال سے جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا تھا اس نے مجھے کچھ ہائپر سا کر دیا تھا اور اس کی وجہ بھی میرا اپنا ایک فیصلہ ہی تھا.....شادی کا فیصلہ.....بزنس سیٹ کرنے کے بعد اب میں خود بھی سیٹل ہو جانا چاہتا تھا لیکن شادی کرنا میرے لیے اتنا بڑا مسئلہ بن جائے گا، یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ آل ریڈی دو جگہ بات بنتے بنتے رہ گئی تھی، ایک منگنی تو پہلے ہی ٹوٹ چکی تھی جس کے لیے انھوں نے کوئی خاص وجہ بھی نہیں بتائی تھی اور اب فضہ کا

انکار.....ایک عام سی شکل وصورت کے انسان کے لیے شادی کرنا اتنا بڑا مسئلہ ثابت ہوگا، یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا.....مجھے اپنی عام سی شکل نے کبھی کمپلیکس میں مبتلا نہیں کیا تھا لیکن آج فضہ کی باتوں نے مجھے سوچنے پر مجبور ضرور کر دیا تھا.....یہ سچ تھا کہ وہ بہت خوبصورت تھی اور اسے اپنے ہی جیسا خوبصورت جیون ساتھی تلاش کرنے کا پورا حق حاصل تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اسے دوسروں کو ڈی گریڈ کرنے کا حق بھی مل جائے۔ وہ اگر اسی بات کو ذرا مختلف انداز میں کہتی تو شاید مجھے اتنا برا نہ لگتا لیکن اس کے پرغرور انداز نے مجھے بہت دھچکا پہنچایا تھا۔ میں اس وقت تو اسے کچھ نہیں کہہ پایا تھا لیکن اب میرا غصہ کمرے کی چیزوں پر اترا تھا اور غصہ اترنے کے بعد میں اس منگنی کو توڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا کیونکہ جو لڑکی مجھے یہ سب کہنے کا حوصلہ رکھتی ہے، وہ نکاح کے وقت انکار کی جرأت بھی رکھتی تھی اور مجھے بہر حال اپنی اور اپنے گھر والوں کی عزت بہت پیاری تھی۔ صورتحال کا اچھی طرح تجزیہ کرنے کے بعد میں اپنے بیڈ سے اٹھا اور شاور لینے کے ارادے سے واش روم میں گھس گیا تا کہ بعد میں گھر والوں کو آرام سے اس نئی صورتحال سے آگاہ کر سکوں۔

☆ ☆ ☆

گھر والوں کو جب میں نے فضہ کے انکار کے بارے میں بتایا تو وہ سب بہت برہم ہوئے۔ امی نے تو بھابھی کو فوراً ہی حکم دے دیا کہ وہ جلدی سے میرے لیے کوئی اور لڑکی تلاش کریں کیوں کہ وہ شادی پہلے سے طے شدہ ڈیٹ پر ہی کرنا چاہتی تھیں۔ یہ ان کا میرے لیے پیار تھا یا فضہ کے خلاف غصہ.....کہ وہ فوری طور پر ''بہو تلاش مہم'' میں لگ گئیں اور میں نے بھی انہیں ایسا کرنے سے نہیں روکا تھا۔ شاید اس سے میری انا کو تسکین مل رہی تھی

لیکن امی نے بھابھی کو یہ ضرور باور کرا دیا تھا کہ وہ اس بار کوئی حور پری ڈھونڈنے کی بجائے اچھی سیرت اور میرے جوڑ کی ہی لڑکی ڈھونڈیں کیونکہ میں بار بار ایسے جذباتی صدمے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

بھابھی اور امی کی جان توڑ کوششیں آخر کار کامیاب ہو ہی گئیں۔انہوں نے نہ صرف ایک اچھی سی لڑکی ڈھونڈ لی بلکہ اب شادی بھی اسی ڈیٹ کو ہو رہی تھی۔شادی کی تیاریاں پورے زور وشور سے جاری تھیں۔اب شادی میں صرف دس دن رہ گئے تھے اس لیے مہمانوں کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔سارے کزنز مل کر خوب ہلا گلا کر رہے تھے اور مجھے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ رہے تھے۔گھر میں ہر وقت ایک ہنگامہ سا برپا نظر آتا تھا۔میں بھی ان ہنگاموں کا حصہ بنا بظاہر خوش اور پر سکون تھا لیکن اندر کہیں ڈر کا ہلکا سا احساس موجود تھا۔شاید پچھلے تلخ تجربوں نے مجھے تھوڑا وہمی بنا دیا تھا۔

مہندی کا فنکشن جوائنٹ تھا،اس لیے ہال میں ارینج کیا گیا تھا۔صبح سے گھر میں ایک افراتفری کا عالم تھا۔تیاریاں تھیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔کسی کے گجرے نہیں مل رہے تو کسی کی میچنگ چوڑیاں غائب ہیں۔کسی کے جوتے گم ہو گئے تھے تو کسی کے موزے ندارد۔پورے گھر میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔اس پر لڑکوں نے اتنی اونچی آواز میں ساؤنڈ سسٹم لگا رکھا تھا کہ ایک دوسرے کی آواز سننا بھی مشکل ہو رہا تھا۔میں تیار ہو کر کمرے سے باہر آیا تو لاؤنج میں ایک ہڑبونگ سی مچی ہوئی تھی۔گھر کے بزرگ لاؤنج میں بیٹھے جلدی جلدی کا شور مچا رہے تھے اور باقی سب ادھر سے ادھر بھاگتے ہوئے اپنے کام تیزی سے نمٹا رہے تھے۔اسی دوران فون کی مسلسل بجتی بیل نے میری توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔سب اپنے اپنے کاموں میں اس قدر مگن تھے کہ کسی نے فون کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔میں نے آگے بڑھ کر فون ریسیو کر لیا۔

''ہیلو .....ہیلو.....''

''جی مجھے .....'' باقی ساری بات دوسری طرف سے بلند ہوتے شور میں دب کر رہ گئی۔

''پلیز آپ ذرا اونچا بولیئے...مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا.....'' میں نے کسی قدر چیخ کر کہا اور سامنے سے آتے عمر کو دیکھ کر میں نے ہاتھ کے اشارے سے ساؤنڈ سسٹم آف کرنے کو کہا۔ جیسے ہی ساؤنڈ سسٹم آف ہوا دوسری طرف سے آتی شور کی آوازیں بھی کچھ معدوم ہو گئیں۔

''دلہن نے نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی ہے۔اسے ہاسپٹل لیکر گئے ہیں.....آپ لوگ مہندی لیکر مت آئیں.....'' دوسری طرف سے یہ کہہ کر رابطہ ختم کر دیا گیا اور میں ریسیور ہاتھ میں پکڑے حیران رہ گیا۔میرے چہرے کے تاثرات نے شاید سب کو ہی کسی گڑبڑ کا احساس دلا دیا تھا۔

''فرزام!....کیا ہوا.....کس کا فون تھا؟'' بھابھی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کسی قدر گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

'' ہوں .....'' میں نے چونک کر ایک نظر انہیں اور پھر ہاتھ میں پکڑے ریسیور کو دیکھا۔

لاؤنج میں ایکدم ہی خاموشی چھا گئی تھی اور سب میری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔میں نے ایک جھٹکے سے ریسیور کریڈل پر رکھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے کمرے میں آ گیا۔بھابھی اور امی دونوں ہی پکارتی ہوئی میرے پیچھے آئیں لیکن میں نے ان کی طرف دھیان ہی نہیں دیا اور کمرے میں آ کر دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔دروازے پر ہوتی ہوئی دستک،لوگوں کی چہ مگوئیاں مجھے اس وقت کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔میرے کانوں میں تو بس ایک ہی

جملے کی بازگشت گونج رہی تھی۔

''دلہن کی خودکشی.....دلہن کی خودکشی.....'' بازگشت تھی کہ مسلسل بڑھتی ہی جا رہی تھی۔تنگ آ کر میں نے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیےاور سر جھکائے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

☆ ☆ ☆

ہم سب ابھی ہاسپٹل سے لوٹے تھے۔انکل نے یہ کہہ کر شادی سے معذرت کر لی کہ وہ اپنی بیٹی کی مرضی کے خلاف نہیں جا سکتے۔لاؤنج میں ہم سب کی موجودگی کے باوجود خاموشی اتنی گہری تھی کہ ہم ایک دوسرے کی سانسوں کی آواز بھی سن سکتے تھے۔کل تک جس گھر میں خوشی کی کھنکھناہٹ اپنے عروج پر تھی،آج وہاں سارے ہنگامے سرد پڑ چکے تھے۔ مجھے اس لڑکی سے زیادہ اپنے آپ پر اور اپنی قسمت پر غصہ آ رہا تھا۔پچھلے تلخ تجربوں کو میں ابھی بمشکل ہی بھول پایا تھا کہ یہ نیا حادثہ ہو گیا۔میں اس وقت کچھ زیادہ ہی frustrated تھا۔اس لیے میں نے کار کی چابی لی اور گاڑی لیکر نکل پڑا۔ذہن اس وقت سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور مختلف سڑکوں پر یونہی رش ڈرائیونگ کرتے ہوئے میں اپنی frustration سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔پورے دو گھنٹے مسلسل ڈرائیونگ کے بعد جب اعصاب کسی حد تک پرسکون ہو گئے تو میں تھک کر گھر واپس آ گیا کہ آخر گھر کے علاوہ کوئی جائے پناہ تھی بھی نہیں۔

آج کل گھر میں ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔شادی میں شرکت کے لیے جو مہمان آئے ہوئے تھے وہ بھی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ چکے تھے اور گھر کے افراد ایک دوسرے سے نظریں چرائے چرائے پھرتے تھے۔میں نے جان بوجھ کر آفس سے گھر دیر سے آنا

شروع کر دیا تھا۔ گھر آتے ہی میں کمرے میں بند ہو جایا کرتا تھا۔ گھر والے میری کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے، اسی لیے انھوں نے بھی مجھے میرے حال پر چھوڑ رکھا تھا۔ ویسے بھی انھیں اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ اس وقت میرے ساتھ کوئی بھی بحث یا بات چیت میرے اندر پنپتے غم و غصے کے آتش فشاں کو پھاڑ سکتی ہے اور میں ایسے میں کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتا ہوں۔ اسی لیے وہ سب ہی اپنی اپنی جگہ خاموش تھے۔

☆ ☆ ☆

ساجد اور عمر سے میری دوستی کالج کے زمانے میں ہوئی تھی اور یہ دوستی اب تک قائم تھی۔ ہمارے گھر والوں کا بھی آپس میں کافی میل جول تھا۔ ہم تینوں دوستوں میں صرف ساجد ہی شادی شدہ تھا اور اس کی شادی کو بھی ابھی صرف ایک سال ہی ہوا تھا۔ عمر شادی کو قید مانتا تھا اور فی الحال اتنی جلدی وہ اپنی آزادی کھونا نہیں چاہتا تھا، اس لیے ابھی تک کنوارا ہی تھا۔ آجکل میں جن کرائسس سے گزر رہا تھا وہ دونوں اس سے اچھی طرح واقف تھے۔ اسی لیے میری ذہنی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے شمالی علاقوں کی سیر کا پروگرام بنا لیا۔ رمضان شروع ہو چکا تھا لیکن ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیوں کہ ہمارے گھروں میں مذہب صرف مسلمان کہلانے کی حد تک محدود تھا۔ پہلے تو میں نے جانے سے صاف انکار کر دیا لیکن وہ دونوں بھی پکے ضدی تھے۔ آخر ان دونوں کی ضد کے آگے مجھے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ گھر والے بھی میرے اس فیصلے سے خوش تھے۔ ان کے خیال میں بھی یہ آؤٹنگ مجھے اس جذباتی صدمے سے باہر لانے کے لیے ضروری تھی۔ ہم تینوں نے جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ہمارا ارادہ جمعے کی رات کو بذریعہ کوچ لاہور سے اسلام آباد جانے کا تھا اور پھر

ہم نے اگلے دن صبح صبح ہی جیپ ہائر کر کے آگے نکل جانا تھا۔

ہفتے کی صبح جب ہم اسلام آباد پہنچے تو سات بج رہے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہم نے ایک جیپ ہائر کی اور اسلام آباد سے نکل پڑے۔ جیپ ساجد ڈرائیو کر رہا تھا جبکہ میں اس کے ساتھ پیسنجر سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور عمر پچھلی نشست پر لیٹنے کے سے انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ سفر شروع کیے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی اور ہم ابھی اسلام آباد کی حدود میں تھے کہ جیپ کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور ہم تینوں اپنی اپنی سیٹوں پر اچھل کر رہ گئے۔ ساجد اور میں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ابھی ہم کچھ سمجھ بھی نہیں پائے تھے کہ جیپ نے جھٹکے کھانے شروع کر دیئے۔ ساجد نے رفتار آہستہ کرتے ہوئے جیپ ایک سائیڈ پر لے جا کر روک دی اور انجن بند کر دیا۔ انجن بند ہونے کے باوجود جب جھٹکے لگنے بند نہ ہوئے تو ہم تینوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

'' زلزلہ.....'' اپنی پوری زندگی میں زلزلے کی یہ شدت ہم پہلی بار دیکھ رہے تھے اس لیے ہمارے چہروں پر پریشانی صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ ہم تینوں نے ہی آیت کریمہ کا ورد کرنا شروع کر دیا اور پھر کچھ دیر بعد جھٹکوں کی شدت کم ہوتے ہوتے ختم ہو گئی۔

''بڑا شدید قسم کا زلزلہ تھا یار!.....'' سب سے پہلے میں نے لب کھولے تھے اور ان دونوں نے بھی اثبات میں سر ہلا دیئے۔

''کیا خیال ہے، واپس نہ چلا جائے'' ساجد نے جیپ سٹارٹ کر کے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ارے نہیں یار!.....زلزلے کے ایسے جھٹکے تو آتے ہی رہتے ہیں.....اس میں کیا بات ہے۔ تو چل آگے'' عمر نے کہا تو میں بھی اس کی تائید کرنے لگا۔

''ہاں یار!.....عمر ٹھیک کہہ رہا ہے.....اب جب یہاں تک آ گئے ہیں تو واپس جانے کا

کوئی تک نہیں بنتا''

''ٹھیک ہے.....جیسے تم دونوں کی مرضی.....'' ساجد نے کندھے اچکا کر کہا اور جیپ آگے بڑھادی۔

☆ ☆ ☆

اسلام آباد سے نکلے ہمیں ابھی دو گھنٹے ہی گزرے ہونگے کہ میرا موبائل بجنے لگا۔ میں نے جیب سے موبائل نکال کر دیکھا تو سکرین پر گھر کا نمبر بلنک کر رہا تھا۔

''ہیلو.....'' میں نے جیسے ہی موبائل آن کیا تو دوسری طرف سے امی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''فرزام بیٹے!.....تم ٹھیک تو ہو نا''

''امی! میں تو ٹھیک ہوں لیکن آپ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہیں'' میں نے کسی قدر حیرانی سے پوچھا۔ ساجد اور عمر بھی بڑے غور سے میری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔

'' بیٹا! ٹی وی پر دکھا رہے ہیں کہ شمالی علاقوں میں زلزلے سے بڑی تباہی ہوئی ہے.....تم اب واپس چلے آؤ'' ان کے لہجے میں ممتا کی تڑپ تھی۔

''امی! آپ پریشان نہ ہوں.....میں بالکل ٹھیک.....''

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑیں ''بس بیٹا! تم واپس آجاؤ۔ جب تک تمھیں دیکھ نہیں لوں گی مجھے چین نہیں آئے گا''

'' آپ بے فکر رہیں۔ ہم لوگ جلدی واپس آجائیں گے .....ظاہر ہے جب آگے راستے ہی بند ہیں تو ہم جا ہی نہیں سکیں گے.....ہم کچھ دن یہاں اسلام آباد میں ہی رک کر واپس چلے آئیں گے'' میں نے انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے لیکن جلدی آنا.....'' انھوں نے نیم رضامندی سے کہا تو میں نے بھی خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

میرے فون بند کرتے ہی ساجد اور عمر کے موبائل بھی تھوڑے تھوڑے وقفے سے بج اٹھے۔ ان کے گھر والوں نے بھی کم و بیش ایسی ہی پریشانی کا ذکر کیا اور فوراً واپس آنے کو کہا۔ میری طرح انھوں نے بھی گھر والوں کو تسلیاں دے کر فون بند کر دیا۔ ہم تینوں ہی اپنی اپنی جگہ سوچوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ جیپ میں ایکدم سے گہری خاموشی چھا گئی تھی اور اس خاموشی کو سب سے پہلے ساجد نے ہی توڑا۔

''اب کیا ارادے ہیں'' ساجد نے جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''I don't know.I am quite confused.....شاید ہمیں واپس چلے جانا چاہیے'' میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

''لیکن میرے خیال میں ہمیں آگے چلنا چاہیے'' عمر نے اچانک کہا تو ہم دونوں ہی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی، اس لیے وہ باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ آرام سے ڈرائیو بھی کر رہا تھا۔

'' دیکھو .....ہم پہلے بھی کوئی پکنک منانے تو جا نہیں رہے تھے۔ ہم تو ایک تھرل انجوائے کرنے جا رہے تھے.....اور اب تک جو حالات پتا چلے ہیں ان سے تو لگتا ہے کہ کوئی بہت ہی بڑا disaster ہوا ہے اور اگر میں غلطی پر نہیں تو وہاں ہم جیسے سر پھروں کی بہت ضرورت پڑے گی.....ہمیں کم از کم ایک بار وہاں چل کر دیکھنا ضرور چاہیے'' عمر نے پر جوش ہوتے ہوئے کہا۔

'' پاگل ہوئے ہو کیا..... پتا نہیں وہاں کیسے حالات ہوں اور تمھیں تھرل سوجھ رہا

ہے.....اگر ہم وہاں جا کے پھنس گئے تو.....'' ساجد کو اس کا آئیڈیا بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ اس لیے اس نے فوراً ہی انکار کر دیا۔

''تو کیا کہتا ہے فرزام.....؟'' عمر نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آئی تھنک کہ ساجد غلط نہیں کہہ رہا.....لیکن اگر تیری بات مان بھی لی جائے تو ہو سکتا ہے کہ آگے راستے ہی بند ہوں اور ہم جا ہی نہ پائیں.....'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''تو میں کون سا کہہ رہا ہوں کہ راستے بند ہونے کے باوجود ہم آگے ضرور جائیں گے.....لیکن کم از کم وہاں تک تو جا سکتے ہیں جہاں تک راستے کھلے ہیں''

''آخر تو چاہتا کیا ہے؟'' ساجد نے چڑ کر کہا۔

''میں صرف دیکھنا چاہتا ہوں کہ قدرت جب قہر ڈھاتی ہے تو کیا ہوتا ہے۔ انسان جو اپنے آپ کو بہت طاقتور مانتا ہے، اس کی بے بسی کی انتہا دیکھنا چاہتا ہوں.....''

عمر اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی پٹی ہو رہا تھا اور میں سمجھ سکتا تھا کہ کیوں۔ وہ دس سال کا تھا جب اس کے پیرنٹس میں علیحدگی ہو گئی تھی، تب سے وہ ایک بٹی ہوئی زندگی جی رہا تھا۔ اس کے پیرنٹس نے دوسری شادیاں کر لیں۔ اس کی ساری زندگی زیادہ تر ہوسٹلز میں گزری تھی۔ اب بھی وہ اپنے فلیٹ میں تنہا ہی رہتا تھا اور اس کا اپنے پیرنٹس سے تعلق صرف ایک دوسرے کی خیریت جاننے تک ہی محدود ہو کر رہ گیا تھا، اس لیے وہ کسی قدر تلخ اور شدت پسند واقع ہوا تھا۔

''میرا خیال ہے چلتے ہیں جو ہو گا دیکھا جائے گا.....بس اتنا آگے نہیں جائیں گے کہ واپس آنے میں کوئی مشکل ہو'' میں نے عمر کی تائید کی تو وہ زیر لب بڑبڑانے لگا۔

''تم دونوں کا یہ تھرل ہمیں مروائے گا''

''ارے یار! ڈرتا کیوں ہے.....ہم ہیں نہ تیرے ساتھ'' عمر نے اس کے کندھے پر

ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''اسی بات کا تو ڈر ہے'' اس نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا تو ہم دونوں نے قہقہہ لگایا۔

☆ ☆ ☆

ہم ایبٹ آباد سے کافی آگے نکل آئے تھے اور اب تک ہمیں کسی خاص پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا لیکن کچھ اور آگے جانے کے بعد جب ہم نے سڑک پر پڑی دراڑیں دیکھیں تو پہلی بار ہم تینوں کے چہرے پر پریشانی کی جھلک نمایاں ہوئی۔ ساجد بڑے محتاط انداز میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اب تک اس زلزلے کو ہم لوگوں نے seriously نہیں لیا تھا لیکن اب ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے حالات تشویش ناک صورتحال اختیار کرتے جا رہے تھے۔ کچھ دور آگے جا کر سڑک بالکل بند ہوگئی۔ اونچائی سے گرنے والے پتھروں نے سڑک بلاک کر دی تھی۔ ساجد نے جیپ ایک سائیڈ پر کر کے روک دی تو ہم تینوں ہی نیچے اتر آئے۔ ہم اس وقت کونسے علاقے میں موجود تھے، یہ جاننے کا ہمیں ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ آبادی سے بھرپور علاقہ ملبے کا ڈھیر معلوم ہو رہا تھا اور حواس باختہ لوگ ادھر سے ادھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ ہم تینوں کی حالت بھی کچھ ان لوگوں سے مختلف نہ تھی۔ موت کی اتنی بے رحمانہ حقیقت دیکھ کر ہم تینوں ہی دہشت زدہ ہو گئے تھے۔ حیرت سے گنگ نہ ہم آگے بڑھ پا رہے تھے اور نہ قدم پیچھے ہی ہٹ رہے تھے۔ تب ہی اچانک ایک عورت بھاگتی ہوئی آئی اور اس نے میرا بازو تھام کر مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔

''میرا بچہ..... میرے بچے کو بچالو..... بابو! میرے بچے کو بچالو۔''

اس کی بھیگی آنکھوں کی التجا میں نجانے کیسی کشش تھی کہ میں خود بخود اس کے ساتھ چلنے لگا۔ ساجد اور عمر بھی مجھے یوں اس عورت کے پیچھے جاتا دیکھ کر میرے پیچھے چلے آئے۔ پھر

ہم تینوں نے بڑی تگ ودو کے بعد اس بچے کو ملبے کے ڈھیر سے نکال لیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ بچہ زندہ تھا اور اسے زیادہ چوٹیں بھی نہیں آئی تھیں۔ مشیتِ الٰہی کا یہ معجزہ دیکھ کر ہم تینوں کے ہی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ عورت اپنے بچے کو لیے ہمیں دعائیں دیتی آگے بڑھ گئی اور ہم ہکا بکا سے وہیں کھڑے رہ گئے۔

''یہ سب.....ہم نے اس کی مدد کیوں کی.....کچھ دیر پہلے میں جس کیفیت سے گزرا ہوں، میں اسے سمجھ نہیں پا رہا ہوں..... یوں لگ رہا تھا جیسے میں ایک ٹرانس کی کیفیت میں ہوں.....اور اب میں سمجھ رہا ہوں کہ ہم یہاں کیوں آئے.....مدد کرنے والا تو اوپر بیٹھا ہے لیکن وسیلہ تو انسان ہی ہوتا ہے نا.....'' میں نے اچانک کہا لیکن میری نظریں گھروں کے ملبے کے ڈھیر پر بیٹھے لوگوں پر جمی تھیں جن کے چہرے تو آنسوؤں سے تر تھے لیکن نظریں شکوہ کناں انداز میں آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''واقعی تو ٹھیک کہہ رہا ہے ہمارا یہاں آنا بے مقصد نہیں'' عمر نے کچھ سوچ کر جواب دیا جبکہ ساجد کی خاموشی بھی ہماری تائید کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

ہمیں یہاں آئے آج دوسرا دن تھا۔ رات ہم نے جیپ میں ہی گزاری تھی اور آج امدادی سرگرمیوں میں کافی تیزی نظر آ رہی تھی کیونکہ کافی سارے امدادی کارکن یہاں لوگوں کی مدد کے لیے پہنچ چکے تھے۔ ہم بھی ان لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے۔ اپنے یہاں ہونے کی اطلاع ہم تینوں نے ہی گھر والوں کو نہیں دی تھی اور دے بھی نہیں سکتے تھے کہ فون لائنز کے ساتھ ساتھ موبائل نیٹ ورکس بھی یہاں کام نہیں کر رہے تھے لیکن پھر بھی ہمیں کوئی پریشانی نہیں تھی کیوں کہ اپنی طرف سے ہم انہیں پہلے ہی مطمئن کر چکے تھے۔

ہم تینوں تھوڑی دیر آرام کی غرض سے ایک نسبتاً اونچے پتھر پر بیٹھے ہوئے تھے کہ سامنے سے ایک لڑکی کو آتا دیکھ کر مستعد ہو کر بیٹھ گئے۔لڑکی پریشان تھی اور جب میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا تو مجھے یاد آ گیا کہ کل جس گھر کے ملبے سے کچھ لاشیں ہم نے نکالیں تھیں وہ اسی لڑکی کے گھر والے تھے۔وہ اکیلی ہی بچ گئی تھی کیونکہ وہ اس وقت گھر میں نہیں تھی وہ صبح سویرے ہی دوسرے گاؤں جانے کیلئے گھر سے نکل گئی تھی، زلزلہ تو رستے میں آیا تھا اور وہ واپس لوٹ آئی مگر اُسے بہت دیر ہو گئی تھی.....اس کے گھر کے تمام افراد اس زلزلے کی نذر ہو چکے تھے۔

''وہ ایک بچہ زخمی ہے .....میں اسے اٹھا کر میڈیکل کیمپ تک نہیں پہنچا سکتی اگر آپ.....'' اس نے ہمارے سامنے آ کر رکتے ہوئے کہا۔

''میں چلتا ہوں'' میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور پھر اس کی تقلید میں اس بچے تک پہنچ گیا۔بچے کی عمر چھ سات سال کے قریب تھی اور اس کی ٹانگ شدید زخمی تھی شاید ملبے کے نیچے دبا ہونے کی وجہ سے سارا وزن اس کی ٹانگ پر ہی پڑا تھا۔میں نے احتیاط سے بچے کو اپنے دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا۔درد کی شدت سے وہ نیم بے ہوش ہو چکا تھا لیکن کبھی کبھی اس کے منہ سے ہلکی سی سسکی نکل جاتی تھی۔میں اسے لے کر میڈیکل کیمپ کی طرف چلنے لگا تو وہ بھی میرے ساتھ ساتھ ہی چلنے لگی۔اس کے چہرے پر فکرمندی کی گہری چھاپ تھی۔

''یہ بچہ آپ کا کوئی relative ہے'' اسے اتنا فکرمند دیکھ کر میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''نہیں.....لیکن کسی کا تو ہوگا'' اس نے بچے کے زرد پڑتے چہرے پر نظر ڈال کر کہا۔

''ویسے آپ بہت بہادر ہیں ورنہ اپنوں کو کھو کر تو انسان اپنے حواس ہی گم کر بیٹھتا ہے اور آپ ہیں کہ دوسروں کے دکھ دور کرنے کی کوششیں کر رہی ہیں'' مجھے اس کے جذبے نے بہت متاثر کیا تھا ورنہ یہاں تو میں نے مردوں کو بھی بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا تھا اور وہ ایک عورت ہو کر نہ صرف اپنے درد کو جھیل رہی تھی بلکہ دوسروں کے درد کو بھی

محسوس کر رہی تھی۔

''انسان بہادر نہیں ہوتے .....حالات انہیں بہادر بننے پر مجبور کر دیتے ہیں..... میں تو اپنوں کو کھو ہی چکی ہوں اور یہ زخم تو شاید اب زندگی بھر نہیں بھریں گے لیکن اس وقت ان زخموں کو کریدنے سے زیادہ ضروری کسی اور کو زخمی ہونے سے بچانا ہے.....'' اس کا لہجہ بکھرا ہوا مگر پُرعزم لگ رہا تھا۔ میں نے حیرت سے اپنے ساتھ چلتی اس لڑکی کو دیکھا جس کی آنکھوں میں دکھ کا بہت گہرا تاثر منجمد ہو کر رہ گیا تھا لیکن اس نے خود کو آنسوؤں میں بہنے نہیں دیا بلکہ ان آنسوؤں کو ہی اپنی طاقت بنا لیا تھا۔

میڈیکل کیمپ پہنچ کر میں نے بچے کو ڈاکٹر کے حوالے کیا اور ہم دونوں کیمپ سے باہر آ کر کھڑے ہو گئے۔

''ایک بات کہوں آپ سے .....؟'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے اچانک پوچھا تو وہ سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگی۔

''آنسو انسان کو کمزور ثابت نہیں کرتے اس لیے انہیں کبھی کبھی بہ جانے دینا چاہیے کیونکہ اگر یہ آنکھوں کے اندر ہی رہ جائیں تو انسان کو پتھر بنا دیتے ہیں.....اور میں نہیں چاہتا کہ ایک اتنی اچھی، جذبوں سے بھرپور لڑکی پتھر بن جائے'' میں نے ایک نظر اس کی آنکھوں میں دیکھا جو حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھیں اور پھر وہاں سے واپس چلا آیا۔

☆ ☆ ☆

شام کا وقت تھا اور پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے کچھ خنکی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں اپنے سامان میں سے جیکٹ نکالنے کیلئے جیپ کے پاس چلا آیا۔ اپنے بیگ سے جیکٹ نکال کر پہننے کے بعد میں جیپ کا دروازہ بند کر کے واپس مڑنے ہی والا تھا کہ اسے اپنی طرف

آتا دیکھ کر رک گیا۔

''کیسی ہیں آپ؟'' میں نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔وہ صبح کی نسبت مجھے کچھ بدلی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔اس کی آنکھوں میں دکھ کا جو بہت گہرا تاثر منجمد ہو کر رہ گیا تھا، وہ اب مدھم سا محسوس ہو رہا تھا۔

''پہلے سے بہت بہتر.....آپ نے ٹھیک ہی کہا تھا آنسو ہمیں کمزور نہیں کرتے بلکہ بہ جائیں تو دل کا بوجھ کم کر دیتے ہیں'' اس نے تشکر سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور آج پہلی بار ہوا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکان جھلک دکھلا کر غائب ہو گئی تھی لیکن میرے لیے یہ بھی بہت تھا کہ وہ اس شدید جذباتی صدمے سے باہر آ چکی تھی جو میں نے پہلے ہی دن اس کی آنکھوں میں پڑھ لیا تھا۔

''ویسے میں کسی کو مشورہ دیتا نہیں سوائے دوستوں کے لیکن آپ کو دیکھ کر لگا کہ آپ کو ان دونوں چیزوں کی ضرورت ہے.....دوستی کی بھی اور مشورے کی بھی.....'' میں نے بڑے ہی دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''میرا نام عروبہ ہے.....عروبہ ترمذی.....'' اس نے پراعتماد انداز میں کہا۔

''اور میں فرزام.....ویسے آپ کا لہجہ بتاتا ہے کہ آپ یہاں کی نہیں لیکن.....'' میں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

''صحیح کہا آپ نے.....studies کی وجہ سے میں زیادہ تر ہوسٹلز ہی میں رہی ہوں.....اب بھی یونیورسٹی سے ایک ہفتے کی چھٹی لیکر تین دن پہلے ہی لاہور سے آئی تھی کہ یہ سب.....'' وہ کہتے کہتے ایکدم خاموش ہو گئی۔اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تھے۔اس نے فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔

''یہی زندگی ہے.....حادثوں، مشکلوں اور پریشانیوں سے بھری ہوئی.....کب یہ کس

موڑ پر لے جا کر کھڑا کر دے، کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن ہمیں ہر حال میں اس موڑ سے گزرنا پڑتا ہے .....کیسے.....اس کا فیصلہ ہمیں کرنا ہوتا ہے اور کبھی کبھی تو فیصلوں کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔حالات ہمیں اس رو میں بہنے پر مجبور کر دیتے ہیں'' میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ اس وقت کس جذباتی دور سے گزر رہی ہے۔

'' اور اگر حالات ہمیں اپنی ہی رو میں بہنے پر مجبور کرنے کی بجائے ایک ہی جگہ پر ٹھہرنے پر مجبور کر دیں تو.....'' اچانک ہی اس نے نظریں اٹھائی تھیں۔اس کی آنکھوں میں ان گنت سوال اور بے انتہا درد تھا۔

''ایسا وقتی طور پر تو ممکن ہے لیکن ہمیشہ کے لیے نہیں.....تھوڑا وقت ضرور لگے گا لیکن یہ جمود ٹوٹ جائے گا.....ویسے آئی تھنک تمھیں لاہور واپس چلے جانا چاہیے you feel better there یہاں رہو گی تو زندگی میں آگے نہیں بڑھ پاؤ گی۔یہ یادیں ہمیشہ تمھیں اپنی طرف کھینچتی رہیں گی .....'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے بڑے ہی نامحسوس انداز میں تکلف کی دیوار گرائی تھی۔

''میرے پاس ان یادوں کے سوا اب کچھ بچا بھی نہیں۔پھر چاہے میں یہاں رہوں یا کہیں اور کیا فرق پڑتا ہے.....لیکن یہاں کم از کم جینے کا ایک مقصد تو ہے اور کچھ نہیں تو ان لوگوں کا درد ہی بانٹ لوں گی جبکہ وہاں جا کر تو.....''

''درد تو بانٹ لو گی لیکن ..... کہیں تم خود اپنے آپ کو نہ کھو دو'' میں یہ کہہ کر فوراً ہی وہاں سے چلا آیا لیکن اس کی آنکھوں میں ابھرنے والے تاثر کو میں نے بخوبی دیکھ لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

مجھے یہاں آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔اپنے گھر سے رابطے کی فی الحال کوئی صورت نہیں

بن پائی تھی لیکن ساجد گھر واپس جانے پر اصرار کر رہا تھا۔عمر کو تو ویسے ہی کوئی پروا نہیں تھی کہ وہاں کون تھا جو اس کے لیے فکر مند ہو۔جبکہ میں ابھی جانا نہیں چاہتا تھا اور اس کی وجہ شاید عروبہ تھی۔پتا نہیں کب چپکے سے وہ اس دل میں آ کر براجمان ہوگئی کہ مجھے پتا ہی نہیں چلا لیکن ابھی تو میں یہ خود بھی ماننے سے ڈر رہا تھا کہ پچھلے تلخ تجربوں کی یاد ابھی تک ذہن میں تازہ تھی۔

ہم تینوں بیٹھے قہوہ پی رہے تھے، جب ساجد نے کسی قدر جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آخر تم دونوں کے ارادے کیا ہیں .....کچھ اندازہ ہے کہ گھر والے ہمارے لیے کتنے پریشان ہوں گے''

''یار! سب کچھ تو تیرے سامنے ہے۔میں مانتا ہوں کہ ایڈونچر کا شوق ہمیں یہاں تک لایا تھا لیکن .....تجھے نہیں لگتا کہ ان لوگوں کو ہماری ضرورت ہے .....یہاں آنے کے بعد پہلی بار احساس ہوا ہے کہ زندگی کیا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے ورنہ اب تک تو ہم بے خبری کی زندگی جی رہے تھے اور یقین مان ساجد خدا سے ڈر کا احساس پہلی بار میں نے یہاں آ کر محسوس کیا ہے اور.....''

''اور پہلی بار ہی کوئی لڑکی ملی ہے جس نے تیرے دل میں محبت کا احساس جگایا ہے'' عمر نے درمیان سے میری بات اچک لی تو میں نے گھور کر اسے دیکھا۔

''بکواس تو ختم ہے تجھ پر''

''اچھا تو یہ بکواس ہے.....تو ٹھیک ہے میں عروبہ سے جا کر کہہ دیتا ہوں کہ اس کا کوئی رہا نہیں اور میرے تو اپنے نہ ہونے کے برابر ہیں تو اگر ہم دونوں .....شادی .....'' عمر نے شرارت سے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''کیا کہا تو نے.....تیری ٹانگیں توڑ دوں گا....تو جا تو سہی اُس کے پاس.....''

میں فوراً ہی بھڑک اٹھا۔

''دیکھا ساجد! میں نے کہا تھا نا کہ یہ مرمٹا ہے اس پر.....'' عمر نے یوں خوش ہوتے ہوئے کہا جیسے اس نے یہ سب جان بوجھ کر میرے دل کا حال معلوم کرنے کے لیے کہا تھا اور میں اپنی بے اختیاری پر ایک گہرا سانس بھر کر رہ گیا کیونکہ اب انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

''فرزام!.....تو اس سے کہہ دے پھر آگے وہ جو بھی فیصلہ کرے اور ہم بھی آخر کب تک یہاں رہ سکتے ہیں.....ویسے میرے خیال میں تو اسے بھی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔جن حالات سے وہ گزر رہی ہے ان میں تو.....'' ساجد کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں نے کاٹ دی۔

''اسی لیے تو کہنے سے ڈرتا ہوں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ وہ میرا ساتھ کسی مجبوری کے تحت قبول کرے.....اور شاید اس وقت کہوں گا تو اس کی مجبوری نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے فیصلے کی راہ میں حائل ہوگی''

''لیکن اگر تو نے دیر کی تو کہیں بہت دیر نہ ہو جائے'' ساجد نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''آئی تھنک ہی از رائٹ.....ڈر کو ایک سائیڈ پر رکھ اور جا کر کہہ دے اسے'' عمر نے بھی اس کی تائید کی تو میں سوچوں میں گھر گیا۔

☆ ☆ ☆

میں آج صبح سے ہی اسے ڈھونڈ رہا تھا اور پھر وہ مجھے ایک درخت کے تنے سے سر ٹکائے سوچوں میں گم بیٹھی نظر آ گئی۔میں آہستہ روی سے چلتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔آہٹ پا کر اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں اور پھر مجھے دیکھ کر اس نے دوبارہ مطمئن سے انداز

میں نظریں سامنے قطار در قطار بنے کیمپوں پر جما دیں۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' میں نے بھی اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ کچھ دیر وہ یونہی بنا پلکیں جھپکائے چپ چاپ دیکھتی رہی۔

''سوچیں تو ساری بس ایک ہی جگہ آ کر ٹھہر گئی ہیں'' اس نے ایک گہرا سانس بھر کر کہا اور اس کی نظریں اپنی ہاتھوں کی لکیروں سے الجھنے لگیں۔

یہاں آنے سے پہلے میں اس لڑکی کو جانتا تک نہیں تھا لیکن آج لگتا تھا جیسے میں اس کی ہر ان کہی بات، اس کی خاموشی کی زبان بھی سمجھنے لگا ہوں۔ اتنے کم دنوں میں کسی کو اس حد تک جان لینے کا دعویٰ.....میں خود بھی حیران تھا لیکن بہر حال یہ سچ تھا.....عروبہ کی خاموش نظریں میرے دل کو چھو گئیں اور میں نے فوری طور پر اس سے حال دل کہنے کا فیصلہ کر لیا۔

''عروبہ!.....میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ویسے میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں بھی کبھی زندگی میں کسی سے یہ کہوں گا.....'' میں نے ذرا تمہیدی انداز میں کہا تو اس نے پہلی بار براہ راست میری آنکھوں میں دیکھا لیکن اس کی آنکھوں میں نہ تو حیرت تھی اور نہ سوال ہی اور اسی بات نے مجھے کسی قدر حیرت زدہ کر دیا۔

''میں سن رہی ہوں فرزام صاحب!.....گو کہ میں جانتی ہوں کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں لیکن پھر بھی میں آپ کی زبان سے سننا چاہوں گی'' اس کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا اور میں اس ہر پل رنگ بدلتی لڑکی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پہلے بھی اس کے اعتماد نے مجھے چونکایا تھا۔ جس طرح وہ اپنا غم بھول کر امدادی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی وہ میرے لیے بہت انوکھا تھا ورنہ میں تو اپنے ساتھ ہونے والے ان چھوٹے موٹے حادثوں سے گھبرا کر حوصلہ ہی چھوڑ بیٹھا تھا اور یہ لڑکی جتنی بہادری سے سب سہہ رہی تھی وہ میرے لیے بالکل

نیا اور مختلف تھا۔شاید یہ اس کی بلند ہمتی ہی تھی جس نے مجھے اس کے بارے اتنے مختلف انداز میں سوچنے پر مجبور کیا تھا۔

''فرزام!.....میں منتظر ہوں.....'' اس نے کہا تو میں جیسے کسی خیال سے چونک اٹھا۔

''عروبہ!.....میں ایک بہت ہی سیدھا سادھا سا انسان ہوں اور مشکلوں سے دور بھاگتا ہوں.....میں یہاں مدد کی نیت سے نہیں آیا تھا بلکہ تم اسے ایڈونچر یا تجسس کہہ سکتی ہو جو مجھے یہاں کھینچ لایا.....لیکن یہاں آ کر زندگی کے معنی سمجھ میں آ گئے اور تم سے مل کر، تمھارے حوصلوں کو دیکھ کر یہ دل کب تمھارے ساتھ کی خواہش کر بیٹھا مجھے پتا ہی نہیں چلا.....اپنے بارے میں تو میں تمھیں سب کچھ بتا ہی چکا ہوں۔آج صرف اتنا کہوں گا کہ میں یہ تو نہیں جانتا کہ میں جو تمھارے لیے محسوس کرتا ہوں وہ محبت ہے یا نہیں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ تمھاری یہ ادھوری خاموش سی آنکھیں میرے اندر بس گئی ہیں'' میں نے پورے خلوص کے ساتھ خود کو اس کے سامنے پیش کر دیا تھا اور اب میں آنکھوں میں بے چینی سموئے اس کا جواب سننے کا منتظر تھا۔

''آپ نے ٹھیک کہا تھا اس وقت میرا اقرار میری مجبوری لگے گا اور میں نہیں چاہتی کہ آپ جیسے اچھے انسان کا ساتھ میں کسی مجبوری کے تحت آ کر قبول کروں.....آپ کتنے اچھے ہیں یہ بات آپ کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں کم از کم میرے سامنے تو نہیں.....ان چند دنوں کی ملاقات کے بعد میں اتنا تو یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ کا ساتھ کسی بھی لڑکی کی خوش نصیبی ہوگا اور یہ خوش نصیبی تو میرے حصے میں لکھی جا چکی تھی تو پھر آپ کسی اور کے ساتھ کیسے چل سکتے تھے.....اس کے علاوہ مجھے اور کچھ نہیں کہنا سوائے اس کے کہ میں آپ کا پرپوزل آپ ہی کے شہر میں اس کرائسس سے نکلنے کے بعد قبول کرنا چاہوں گی.....''
اس نے شرمیلی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے کہا اور میں حیرانی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

''عروبہ!...تم کیسے.....؟'' مجھے لگا کہ لفظ اچانک ہی جیسے ختم ہو گئے ہیں۔

''سوری لیکن اس دن میں نے آپ کے دوستوں کی باتیں سن لی تھیں''اس کا لہجہ ہلکی سی ندامت لیے ہوئے تھا۔

''عروبہ!.....میں نے آج تک سنا تھا کہ کوئی بھی حادثہ زندگی سے بڑا نہیں ہوتا اور آج مجھے یقین آ گیا ہے کہ واقعی یہ سچ ہے .....ہم دونوں کی زندگیوں میں ہونے والے حادثوں نے ہی ہمیں ملایا ہے ورنہ میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی حادثہ کسی نئے رشتے کی شروعات بھی کر سکتا ہے .....جیسے ہمارا رشتہ.....'' میں نے اپنا ہاتھ آگے کیا تو اس نے پورے اعتماد کے ساتھ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

☆ ☆ ☆

مسافت

پورا ایک دن اور ایک رات وہ تکلیف سے تڑپتے باسم کا سر اپنی گود میں رکھے بیٹھی رہی تھی حالانکہ وہ خود بھی کافی زخمی تھی لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری تھی اور اپنے دوپٹے کا پلو پھاڑ کر اس کی زخمی ٹانگ پر باندھ دیا تھا۔ اور ایسے ہی کتنے زخمی اس کے آس پاس پڑے کراہ رہے تھے لیکن ان کی دادرسی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ٹھنڈے مردہ جسموں سے لپٹے بچے چیخ چیخ کر اپنی ماؤں کو پکار رہے تھے اور کہیں اپنے لہولہان جگر گوشوں کو لیے ماں باپ پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ ایسی قیامت خیز بربادی ہوئی تھی کہ ہر کسی نے اپنے بہت سے پیاروں کو کھو دیا تھا۔

''آٹھ اکتوبر.....ایک ہولناک دن اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے اور ایک نئی صبح ہونے جا رہی ہے۔ اپنے اتنے سارے پیارے رشتوں کو کھو کر بھی اگر میں زندہ ہوں تو صرف اس ایک رشتے کے سہارے.....اگر اس کی سانسوں کی ڈور ٹوٹ گئی تو میرے جینے کی امید بھی ختم ہو جائے گی۔ اس کی ان ڈوبتی اکھڑتی سانسوں کو کھینچ کر زندگی بنا دے میرے مولا!!!.....زندگی بنا دے....''

زریں نے صبح کی روشنی نمودار ہوتے دیکھ کر آسمان پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ یہ وہ آخری سوچ تھی جو اس کے ذہن کے پردے پر ابھری تھی۔ اس کے بعد اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرے منڈلانے لگے اور وہ بے ہوش ہو کر باسم کے پہلو میں ہی گر گئی۔

ایک مہربان لمس اس نے اپنے ہاتھوں پر محسوس کیا تھا اور کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

''آہ.....'' اجنبی جگہ، اجنبی چہرہ دیکھ کر اس نے بے اختیار اٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن اسی اجنبی مہربان شخص نے اس کے کندھے پر اپنے ہاتھ کے ہلکے سے دباؤ سے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔

''لیٹی رہیے پلیز!.....آپ کے زخم زیادہ گہرے نہیں لیکن ان کی بینڈج بہرحال ضروری ہے'' اس نے نرم لہجے میں کہا اور اس کے ہاتھ کی بینڈج مکمل کرنے لگا۔

پوری طرح ہوش میں آتے ہی کل کا حادثہ پوری جزئیات کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا تھا۔ ہوش آتے ہی احساسات بھی بیدار ہو گئے تھے۔

''باسم!.....'' وہ ایکدم ہی تڑپ کر اٹھ بیٹھی اور وہ جو اس کی بینڈج ختم کر کے پلٹ ہی رہا تھا، رک گیا۔

''یہ آپ بار بار اٹھ کیوں جاتی ہیں.....؟'' اس نے دھیمی سی مسکان ہونٹوں پر سجائے پوچھا۔

''باسم.....باسم کہاں ہے.....؟'' زریں نے اس کی بات نظر انداز کر کے بے چینی سے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے پوچھا لیکن اس کیمپ میں موجود اتنے سارے زخمیوں میں وہ اسے کہیں نظر نہ آیا۔

''باسم .....شاید آپ ان کی بات کر رہی ہیں جنھیں آپ کے ساتھ یہاں لایا گیا تھا اور ان کا ایک پاؤں شدید زخمی تھا'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''جی.....جی.....وہی باسم ہے.....کہاں ہے وہ.....وہ ٹھیک تو ہے نا....'' اس نے ایک ہی سانس میں بہت سارے سوال کر دیئے۔

''آئی ایم سوری لیکن.....'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ زریں کا چہرہ ایکدم زرد پڑ گیا اور اسے لگا کہ بس اب وہ دوسرا سانس ہی نہیں لے پائے گی۔زریں کا چہرہ دیکھ کر اسے فوراً ہی اپنے غیر مناسب الفاظ کا احساس ہو گیا۔

''سوری میرا وہ مطلب نہیں تھا۔وہ ٹھیک ہیں۔ہم نے ابتدائی بینڈج تو کر دی تھی لیکن ان کی ٹانگ کا زخم بروقت امداد نہ ملنے کی وجہ سے بگڑ گیا تھا۔انھیں فوراً آپریشن کی ضرورت تھی اور یہاں ڈاکٹرز کم اور میرے جیسے میڈیکل کے سٹوڈنٹس زیادہ ہیں۔اور آپریشن کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے ہم آپریشن کا رسک بھی نہیں لے سکتے تھے اس لیے انھیں دوسرے سینیرین کیسز کے ساتھ ہیلی کاپٹر کے ذریعے ہاسپٹل شفٹ کر دیا گیا ہے'' اس نے ذرا شرمندگی سے وضاحت دیتے ہوئے کہا تو زریں کا زرد پڑتا چہرہ بھی آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگا۔

''کون سے ہاسپٹل .....مجھے اس کے پاس جانا ہے....ابھی....'' وہ تیزی سے بستر

سے اتر کر کھڑی ہوئی تو پاؤں پر وزن پڑنے کی وجہ سے کراہ کر رہ گئی۔اس نے اپنے بائیں پاؤں پر نظر ڈالی تو اس پر بھی بینڈج ہوئی تھی۔ وہ ایک گہرا سانس بھر کر دوبارہ بیٹھ گئی کیوں کہ وزن پڑنے کی وجہ سے پاؤں کے درد میں اضافہ ہو گیا تھا۔

''دیکھا.....اسی لیے فی الحال میں آپ کو اٹھنے سے منع کر رہا تھا.....'' اسے دوبارہ بیٹھتے دیکھ کر اس نے کہا تو وہ بے بسی سے اسے دیکھنے لگی۔

''او کے..... ہاسپٹل کے بارے میں معلومات آپ کو ڈاکٹر جواد سے مل جائیں گی اور جہاں تک آپ کے ان کے پاس جانے کا مسئلہ ہے تو میں اتنا کر سکتا ہوں کہ آج ہماری ایک ٹیم کچھ میڈیسن لے کر آ رہی ہے اور کل جب ان کی واپسی ہو گی تو آپ بھی انھی کے ساتھ چلی جائیے گا۔ وہ آپ کو ہاسپٹل تک پہنچا دیں گے''

اس کی آنکھوں کا ادھورا پن اور اس کے چہرے پر پھیلا کرب دیکھ کر وہ خود کو اس کی مدد کرنے سے روک نہیں پایا تھا۔

اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے نم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اٹس او کے.....آپ آرام کریں۔ میں چلتا ہوں'' یہ کہہ کر وہ کیمپ سے باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

میڈیکل کیمپ میں مزید زخمیوں کے آنے کے بعد اسے دوسرے کیمپ میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ لیٹے لیٹے وہ تھکنے لگی تھی۔ وہ ہولناک صبح کا منظر بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا اور اس کی آنکھیں بھیگنے لگتی تھیں۔ ان سوچوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے وہ اٹھی اور کیمپ سے نکل کر باہر آ گئی۔ پاؤں میں اب بھی درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اس لیے چال

میں ہلکی سی لنگڑاہٹ نمایاں تھی۔وہ کیمپ سے باہر ایک بڑے سے پتھر پر آ کر بیٹھ گئی۔دھوپ نکلی ہوئی تھی جو اس ہلکے سے خنک موسم میں بھلی معلوم ہو رہی تھی۔آوارہ بادلوں کے چند ٹکڑے بھی آسمان پر کہیں کہیں دکھائی دے رہے تھے۔زندگی نے اچانک رخ بدلا تھا مگر زخم ابھی تازہ تھا اس لیے موسم کی خوبصورتی بھی اس کے مزاج پر کوئی خوشگوار اثر نہ ڈال پائی تھی۔

''بس لمحوں کا کھیل تھا اور زندگی بدل کے رہ گئی۔کتنی ہی زندگیاں موت کی اندھیری وادی میں جا سوئیں.....کتنے زخمی ہوئے.....کتنی ماؤں کی گودیں اجڑ گئیں.....کتنے بچے یتیم ہو گئے.....لیکن قسمت کے کھیل بھی عجیب ہیں، جسے زندگی ملی ہے اسے ہر حال میں جینا ہی پڑتا ہے.....پھر چاہے زخم کتنا ہی گہرا اور نا قابل برداشت ہو.....لیکن جو زخم دیتا ہے اسے برداشت کرنے کا حوصلہ بھی وہی دیتا ہے'' اس نے بے بسی سے سر جھکائے اردگرد بیٹھے لوگوں پر نظریں دوڑاتے ہوئے سوچا۔ہر آنکھ اشکبار تھی، ہر چہرہ غم کی تصویر بنا ہوا تھا اور آنکھیں تو خود اس کی بھی بھیگ رہی تھیں حالانکہ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں وہ اتنا روئی تھی کہ اسے لگتا تھا آنسو ہی خشک ہو جائیں گے۔اس نے ایک شکوہ بھری نظر آسمان پر ڈالی تو اچانک کبھی کا پڑھا ہوا ایک جملہ اس کے ذہن کے پردے پر ابھر آیا۔

''وہ اپنے پیارے بندوں کو ہی آزماتا ہے اور انسان کی آزمائش دو طرح سے کی جاتی ہے کبھی نعمتیں اور آسائشیں دے کر انسان کا ظرف آزمایا جاتا ہے تو کبھی سب کچھ چھین کر انسان کا صبر آزمایا جاتا ہے.....تو یہ ہمارے صبر کی آزمائش ہے'' اس نے ایک گہرا سانس بھر کر تھکے سے انداز میں سر جھکا لیا۔

''سنیے.....'' اچانک ہی اسے اپنے قریب ایک آواز سنائی دی تھی۔اس نے چونک کر سر اٹھایا تو اس کے سامنے ایک اٹھائیس انتیس سال کا نوجوان ہاتھ میں کاغذ قلم لیے کھڑا

تھا۔اس کے انداز سے ہی وہ سمجھ گئی کہ وہ کوئی اخباری رپورٹر ہے۔

''کل جو یہ زلزلہ آیا ہے ،جو تباہی ہوئی ہے اس کے بارے میں کچھ ہمیں بتائیں گی؟ آپ نے کیا دیکھا،کیا محسوس کیا.....وہ پل.....وہ لمحہ .... کچھ بتائیں گی آپ.....''اس نے اپنے مخصوص رپوٹنگ سٹائل میں پوچھا۔

''نہیں'' وہ قطعیت سے کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جی'' اس کے صاف انکار پر اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ اسے نظرانداز کرتی پلٹ گئی۔اسے یوں جاتا دیکھ کر وہ فوراً ہی اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''معاف کیجیے گا، میں اس حادثے کے حوالے سے آپ کے تاثرات جاننا چاہتا ہوں اور آپ ہیں کہ.....''

''کیا جاننا چاہتے ہیں آپ.....یہ کہ کیسے میں نے اپنے گھر کو اپنے پیاروں کی قبر بنتے دیکھا ہے.....یا پھر یہ کہ کیسے پورا ایک دن اور ایک رات میں نے اس آسمان تلے ایک زخمی وجود کو اپنی بانہوں میں لیے گزاری ہے.....یا ان آنسوؤں کی داستان سناؤں جو اسے بہنا شروع ہوئے ہیں کہ تھمنے میں ہی نہیں آ رہے.....اپنے کس سوال کا جواب چاہیے آپ کو؟.....کیا ہماری آنکھوں کا ادھورا پن آپ کو نظر نہیں آتا؟.....ہر ایک چہرے پر بنی آنسوؤں کی یہ لکیریں آپ سے کچھ نہیں کہتیں؟.....کیا ہماری حالت ہمارے درد کی غماز نہیں؟.....زندگی ہمارے ہاتھ سے مٹھی میں بند ریت کی طرح پھسلتی چلی گئی اور آپ.....'' وہ بڑی مشکل سے خود کو سمیٹ پائی تھی لیکن اس کے ایک سوال نے پھر سے اس کے زخموں کو ادھیڑ ڈالا تھا۔زریں کے لہجے کا بھاری پن اور آنکھوں سے برسنے کو بے تاب آنسو دیکھ کر وہ ذرا شرمندہ ہو گیا۔

''ہم آپ کا درد ہی تو بانٹنے آئے ہیں''

''آپ ہمارا درد بانٹنے نہیں..... بیچنے آئے ہیں'' وہ کہہ کر آہستہ روی سے چلتی ہوئی اپنے کیمپ کی طرف بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر جواد کی سفارش کی وجہ سے وہ میڈیکل ٹیم اسے اپنے ساتھ لے جانے پر رضامند ہوگئی تھی اور ڈاکٹر جواد کی سفارش کی وجہ وہی مہربان آنکھوں والا ڈاکٹر ہی رہا ہوگا، اس بات کا اسے بخوبی احساس ہو گیا تھا۔میڈیکل ٹیم دو گھنٹے بعد روانہ ہونے والی تھی۔سامان تو اس کے پاس کوئی تھا نہیں اور گھر جا کر کچھ لانے کی نہ تو اس میں ہمت تھی اور نہ اس کا زخمی پاؤں ہی اس قابل تھا کہ وہ چل کر اوپر پہاڑی تک جا سکتی۔ویسے بھی یہ میڈیکل کیمپ اس جگہ سے کئی میل دور تھا اور اسی فاصلے کی وجہ سے امدادی ٹیم کو وہاں تک پہنچنے میں پورا ایک دن لگ گیا تھا۔وہ شال کو اچھی طرح لپیٹ کر کیمپ کے آگے پڑے اسی بڑے سے پتھر پر آ کر بیٹھ گئی۔

''لگتا ہے جیسے زندگی ایک مقام پر آ کر ٹھہر سی گئی ہو.....''اس نے بے خیالی میں اپنی ہاتھ کی لکیروں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

''ہاتھ کی لکیروں سے مت الجھیے.....ورنہ زندگی اور الجھ جائے گی''اچانک ہی اسے اپنے قریب سے آواز سنائی دی تھی۔زریں نے چونک کر نظریں اٹھائیں تو اس سے کچھ ہی فاصلے پر وہ بھی ایک پتھر پر بیٹھا سگریٹ پینے میں مشغول تھا۔

''آپ .....'' زریں نے کچھ کہتے کہتے لب بھینچ لیے حالانکہ زریں کو اس کی

مداخلت سخت ناگوار گزری تھی۔

''مجھے رضا کہتے ہیں.....رضا احمد درانی.....جرنلسٹ ہوں اور.....'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور اپنے بارے میں بتاتا، زریں کے چہرے پر بکھرے ناگواری کے تاثرات دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

''سوری.....شاید میں آپ کی تنہائی میں مخل ہوا ہوں لیکن آپ اسے ہم جرنلسٹوں کی عادت سمجھ لیں یا مجبوری کہ ہم بہت ڈھیٹ واقع ہوئے ہیں.....ایکچوئیلی میں کل ساری رات آپ ہی کے بارے میں سوچتا رہا ہوں....'' اس نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی'' اس نے کڑے تیور سے اسے گھورا تو اسے فوراً ہی اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔

''اوہ سوری .....میں الفاظ کا استعمال غلط کر گیا۔ دراصل میرا مطلب آپ سے نہیں آپ کی بات سے تھا.....وہ آپ نے کہا تھا نا کہ ہم یہاں درد بانٹنے نہیں بیچنے آئے ہیں.....سچ کہوں تو شاید یہ اتنا غلط بھی نہیں۔ اس بھاگتی دوڑتی زندگی میں ہر کوئی اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔ ہم سب مادہ پرست ہو چکے ہیں.....لیکن یقین جانیے میرا یہاں آنا صرف میرے پروفیشن کا حصہ نہیں تھا بلکہ کہیں نہ کہیں ایک احساس موجود تھا اس درد کا، جس سے آپ سب گزر رہے ہیں''

اس نے سگریٹ زمین پر پھینک کر اسے پاؤں سے مسل ڈالا۔ زریں نے حیرت سے اسے دیکھا جو اس دوسری ملاقات میں اسے یکسر مختلف انسان نظر آ رہا تھا۔

''حیرانی ہو رہی ہے نا سن کر کہ ہمارے اندر بھی احساس بستا ہے ورنہ لوگ تو ہمیں بے حس ہی سمجھتے ہیں'' اسے یوں حیرت سے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے طنزیہ انداز میں

مسکراتے ہوئے کہا تو زریں نے فوراً ہی اس پر سے اپنی نظریں ہٹالیں۔

''ویسے ایک بات میں آپ کے بارے میں ضرور کہنا چاہوں گا کہ آپ بہت بہادر ہیں ورنہ یہاں کی حالت دیکھ کر تو تھوڑی دیر کے لیے میرے بھی حواس جواب دے گئے تھے جبکہ آپ نے تو اس قیامت خیز گھڑی کا خود سامنا کیا ہے.....آپ کی ہمت واقعی قابل تعریف ہے'' رضا نے بڑی سچائی کے ساتھ اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

کبھی کبھی بہت زیادہ درد بھی انسان کو بہادر بنا دیتا ہے اور مجھے تو کھونے کی جیسے عادت سی پڑ گئی ہے'' اس نے آسمان پر نظریں جمائے کہا۔

''کہتے ہیں کہ خوشی بانٹنے سے بڑھتی ہے اور درد بانٹنے سے کم ہوتا ہے.....کوشش کر کے دیکھیں شاید یہ آزمودہ نسخہ کام کر جائے۔ ویسے آپ مجھے اپنا دوست کہہ سکتی ہیں اور اتنی گارنٹی تو میں آپ کو دے ہی سکتا ہوں کہ میرے جیسا مخلص دوست آپ کو کہیں نہیں ملے گا'' رضا نے پرخلوص لہجے میں کہا۔

''کچھ درد ایسے ہوتے ہیں جنھیں بانٹا نہیں جا سکتا.....بس سہا جاتا ہے چپ چاپ'' اس کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔

''ایک کوشش کر لینے میں تو کوئی ہرج نہیں ہے نا'' اس نے دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تو کچھ پل کے لیے وہ نظریں جھکائے خاموش بیٹھی اپنی انگلیوں سے کھیلتی رہی۔

''قسمت ہمیشہ مجھ سے چھینتی ہی آئی ہے۔ بہت چھوٹی تھی میں، جب امی کی وفات ہو گئی۔ مجھے تو ان کا چہرہ بھی یاد نہیں بس تصویروں میں ہی دیکھا ہے انھیں۔ بابا جان اور پھوپھو نے ہی پالا ہے مجھے۔ پھوپھا جان کی ایکسیڈنٹ میں موت کے بعد پھوپھو باسم کو لیکر یہیں آ گئی تھیں۔ انھوں نے مجھے کبھی امی کی کمی محسوس نہیں ہونے دی اور بابا کی تو جان ہی

مجھ میں تھی لیکن چھ ماہ پہلے اچانک وہ بھی ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ کر چلے گئے اور اب پھوپھو بھی .....''

وہ کہتے کہتے ایکدم سسک اٹھی۔ باوجود کوشش کے وہ آنسوؤں کو بہنے سے روک نہیں پائی تھی اور دونوں ہاتھ چہرے پر رکھے وہ بے آواز روتی چلی گئی۔ رضا نے بھی اسے دلاسہ دینے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن کچھ دیر رونے کے بعد جب آنسو تھمے تو اس کے دل پر پڑا بوجھ بھی ہلکا ہو گیا۔ اس نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

''پتا نہیں۔ میں نے یہ سب آپ سے کیوں کہا.....لیکن ہاں یہ سب کہہ کر میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی ہوں۔ شاید آپ ٹھیک کہہ رہے تھے مجھے واقعی ایک دوست کی ضرورت تھی''

''میں ہمیشہ ہی صحیح کہتا ہوں اور ویسے بھی کوشش کبھی ضائع نہیں جاتی'' رضا نے کہا تو اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ جھلک دکھا کر غائب ہو گئی۔

رضا نے بہت غور سے اس کی بے جان سی مسکراہٹ اور ویران آنکھوں کو دیکھا تھا اور ایک فیصلہ کر کے مطمئن ہو گیا۔

''آپ سے ایک بات کہوں....آپ مائینڈ تو نہیں کریں گی'' اس نے پرسوچ انداز میں کہا تو وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''حادثے زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔ ان سے گھبرا کر ہم زندگی جینا تو نہیں چھوڑ سکتے نا..... ہاں شاید کچھ دیر کے لیے زندگی ٹھہر ضرور جاتی ہے لیکن بہر حال ہمیں اپنا سفر جاری رکھنا پڑتا ہے اور اکیلے سفر کرنا بہت مشکل ہے۔ اسی لیے اگر یہ سفر کسی کے ساتھ طے کیا جائے تو راستے کی مشکلوں کا سامنا آسانی سے کیا جا سکتا ہے اور سفر کی تھکن کا احساس بھی کم ہو جاتا ہے'' اس نے تمہیدی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا تو

وہ ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔

''ایکچوئیلی گھما پھرا کر بات کرنے کی عادت سی پڑ گئی ہے.....سٹریٹ فارورڈ بات کروں تو میں زندگی کے اس سفر میں آپ کا ہاتھ تھام کر چلنا چاہتا ہوں'' رضا نے پرخلوص انداز میں کہا تو وہ ایک گہرا سانس بھر کر کچھ دیر کے لیے خاموش رہ گئی۔

''مجھے آپ کے خلوص پر کوئی شک نہیں لیکن شاید ایک بات میں آپ کو بتانا بھول گئی کہ میں باسم سے منسوب ہوں اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ بالکل ٹھیک ہے.....لیکن آپ کا جذبہ واقعی قابل قدر ہے.....شاید آپ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے ضروری نہیں کہ ہماری آنکھیں جو دیکھیں وہی پورا سچ ہو'' وہ اعتماد سے کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں دعا کروں گا کہ آپ کی آنے والی زندگی میں آپ کو کچھ اور نہ کھونا پڑے'' اسے اٹھتا دیکھ کر رضا نے دوستانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور خود بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''آپ کی یہ دعا قبول ہوتی ہے یا نہیں، یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن ایک دوست کی اس پرخلوص دعا کو میں ہمیشہ یاد رکھوں گی '' وہ پلٹ کر جانے لگی لیکن پھر کچھ سوچ کر رک گئی۔

''ویسے اگر آپ چاہیں تو یہاں آپ کو ایسے بہت سے ہاتھ نظر آ جائیں گے جو کسی سہارے کے منتظر ہیں اور ان کے پاس جینے کی کوئی امید بھی نہیں.....شاید آپ ان میں سے کسی ایک کی امید بن پائیں.....'' زریں نے بڑے ہی مبہم انداز میں کہا اور آگے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

''اچھی لڑکی! ایک بات جو میں نے تم سے نہیں کہی کہ میں بھی تمہیں کبھی نہیں بھول پاؤں گا بلکہ ایک اجنبی دوست کی طرح ہمیشہ یاد رکھوں گا''

اسے جاتے دیکھ کر رضا نے سوچا اور اس وقت تک اسے دیکھتا رہا جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔

☆ ☆ ☆

Live Thriller

شیرازی ہاؤس کا یہ وسیع وعریض ڈرائینگ روم اور گھر کے مکینوں کا رہن سہن ،اُن کی آسودہ حالی کا منہ بولتا ثبوت تھا ۔ویکٹورین سٹائل کی کھڑکیوں کو میرون رنگ کے دبیز پردوں سے سجایا گیا تھا۔کمرے کے وسط میں لگا چائینیز فانوس اور یہاں کی گئی لائٹنگ اتنی شاندار تھی کہ یہ کمرا بقعہءنور بنا ہوا تھا۔اس پر میچنگ رنگ کے ایرانی قالین اور لیدر کے صوفے اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا رہے تھے۔اس کمرے کے داہنے حصے میں بلیک میٹل کی ڈائینگ ٹیبل رکھی تھی ۔ڈائینگ ٹیبل کی سائیڈ کی پوری دیوار پر لکڑی کی خوبصورت آویزکاری سے ریک بنائے گئے تھے جس میں مختلف موضوعات پر دنیا بھر کی کتابیں بھری پڑی تھیں ۔بے شک ان میں سے گنتی کی چند کتابوں کے سوا زیادہ تر کو تو کھول کر بھی نہیں دیکھا گیا تھا لیکن اس گھر میں آنے والے مہمان اتنی زبردست کولیکشن دیکھ کر گھر کے مکینوں کے ذوق کی داد دیئے بغیر نہیں رہ پاتے تھے....اوراس وقت اس وسیع وعریض ڈرائینگ روم میں صرف ٹی وی کی آواز گونج رہی تھی ۔بیگم رعنا شیرازی تفاخر سے صوفے پر بیٹھی اپنے

nails فائل کر رہی تھیں، کبھی کبھار وہ ایک نظر ٹی وی سکرین پر بھی ڈال لیتیں جبکہ بلیو جینز اور بلیک شرٹ میں ملبوس ہانیہ ان کے بالکل سامنے والے صوفے پر نیم دراز بڑے ہی انہماک سے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔اسی وقت سعد ڈرائینگ روم میں داخل ہوا اور ہانیہ کو اس قدر منہمک دیکھ کر شرارت اس کی آنکھوں میں مچل اٹھی اور وہ دبے قدموں چلتا ہوا اس کے بالکل پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔

بیگم رعنا نے اسے دیکھ کر بھی نظر انداز کر دیا تھا۔

''cockroach''سعد نے اس کے کان کے بالکل قریب ہو کر کسی قدر چیخ کر کہا۔

'' آ .....'' وہ چیخ کر اچھل کر صوفے پر ہی کھڑی ہو گئی۔ریموٹ اس کے ہاتھ سے نکل کر قالین پر جا گرا۔

'' got you'' سعد نے ہنستے ہوئے چٹکی بجا کر اس کی طرف اشارہ کیا اور پھر بیگم رعنا کے ساتھ والے صوفے پر جا بیٹھا۔اس کی شرارت پر بیگم رعنا کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ جھلک دکھا کر غائب ہو گئی۔

''!bro.....'' اسے یوں ہنستے دیکھ کر ہانیہ نے گھور کر اسے دیکھا تھا اور پھر قالین سے ریموٹ اٹھا کر دوبارہ صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔

''ویسے تم اتنے غور سے دیکھ کیا رہی تھیں'' سعد نے ٹی وی سکرین پر نظریں جمائے پوچھا۔

''live thriller'' اس نے اشتیاق سے کہا۔

''یہ تمہیں live thriller لگتا ہے'' اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''کہہ سکتے ہیں....یہ زلزلہ.....یہ تباہی.....interesting fact.....مجھے تو یہ سب کسی thrilling picture ہی کی طرح لگ رہا ہے۔ہاں رونا دھونا تھوڑا بور کر

رہا ہے لیکن اتنا تو چلتا ہے .....اور جو بھی ہے کم از کم تمھاری اس رات والی بورنگ theiller picture سے تو اچھا ہی ہے۔اسے دیکھ کر تو مجھے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں روؤں یا ہنسوں'' اس نے جان بوجھ کر اسے چڑاتے ہوئے کہا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ پیئرس بروسنان کی موویز کا تو وہ دیوانہ ہے اور اس کی کسی بھی مووی کی کوئی برائی کرے، یہ اسے بالکل برداشت نہیں ہوتا۔

''ہانی!.....خبردار جو تم نے اس مووی کے بارے میں ایک لفظ بھی اور کہا تو.....''

وہ فوراً ہی غصے میں آ گیا تھا۔

'' got you''ہانیہ نے ہنستے ہوئے بالکل اسی کے انداز میں چٹکی بجا کر کہا تو وہ خجل سا ہو کر سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ہانیہ کے چہرے پر بکھری شرارتی مسکراہٹ دیکھتے ہی اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ bet ہار گیا ہے۔

''میں نے کہا تھا نا!bro.....تمھیں غصہ دلانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے''اس نے گردن اکڑا کر فرضی کالر جھاڑے۔

''ok I lost.....بولو اب کیا کرنا ہو گا مجھے .....'' اس نے ٹانگیں صوفے پر پھیلا لیں اور دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

''lets see.....سوچنا پڑے گا.....وہ کیا ہے نہ کہ اس ویک میں یہ تیسری بار میں bet جیتی ہوں.....

you know hatrik .....تو سزا بھی ذرا یونیک ہونی چاہیے''اس نے اتراتے ہوئے کہا۔

''زیادہ اوور ہونے کی ضرورت نہیں.....جو بھی ہے،جلدی بولو'' اس نے چڑ کر کہا۔

''don't be jealous bro!.....یہ جیتنا تو میری عادت بنتی جا رہی

ہے۔اگر تم یونہی جیلس ہوتے رہے تو.....'' اس سے پہلے کہ وہ بات مکمل کرتی سعد کا غصے سے تنا چہرہ دیکھ کر فوراً ہی بات پلٹ گئی۔

''ok I have decided.....تمھیں کل کسی کے ساتھ ایک گھنٹا گزارنا ہے.....اس کے ساتھ لنچ کرنا ہوگا.....کچھ رومانٹک باتیں بھی کی جاسکتی ہیں.....'' ہانیہ نے تجسس پیدا کرتے ہوئے رک رک کر کہا۔

''کون.....کس کے ساتھ.....؟'' وہ فوراً سیدھا ہو بیٹھا۔

''وہی.....'' ہانیہ نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ چونک اٹھا۔

''نو ..... ناٹ ہر .....'' اس نے بے یقینی سے کہا۔

'' یس'' اس نے شرارتی انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

''پلیز ہانی!.....تم اور جو مرضی مجھ سے کروالو.....لیکن شائنہ.....نو وے .....'' وہ لجاجت سے کہتے کہتے آخر میں کسی قدر اکڑ گیا۔

''سوچ لو..... bet ہارے ہو تم.....you don't have choice'' وہ کسی بھی طرح نرمی برتنے کو تیار نہیں تھی۔

''my sweet little sister!.... تمھیں مجھ پر تھوڑا سا بھی ترس نہیں آتا.....'' اس نے ایک اور کوشش کی۔

''آتا ہے .....بٹ آئی کانٹ ہیلپ .....مجھے ایک اور bet بھی تو جیتنی ہے.....sorry bro!''

جذباتی ہو کر اس کے منہ سے بے اختیار ہی سچ نکل گیا۔

''کیا.....کیا کہا ابھی تم نے'' ایک اور bet کی بات سن کر وہ چونک اٹھا۔

''کیا.....میں نے کیا کہا.....'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''یہ ایک اور bet کی کیا بات ہے'' اس نے ذرا سختی سے پوچھا۔

''کون سی bet.....لگتا ہے تمھارے کان بج رہے ہیں.....''اس نے صاف انکار کر دیا۔

''مام! دیکھا آپ نے اسے .....کیسی معصوم بن رہی ہے اب .....اس نے ضرور شائنہ سے bet لگائی ہوگی اسی لیے تو مجھے اس کے ساتھ لنچ کرنے کو کہہ رہی ہے.....لیکن ہانی! یہ چیٹنگ ہے''اس نے سختی سے لب بھینچ کر زچ ہو کر کہا۔

''چیٹنگ ....لیکن!bro تم ہی تو کہتے ہو everything is fair in game and war '' اس نے بڑے آرام سے کبھی کی کہی ہوئی اسی کی بات اسے لوٹا دی تھی۔

'' دیکھ لوں گا تمھیں تو .....'' اس نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔

''مام!..... پروگرام شروع ہو گیا.....'' احسن شیرازی کا چہرہ جیسے ہی سکرین پر نظر آیا تو ہانیہ نے اشتیاق سے بھرپور لہجے میں کہا۔

''ڈیڈ آج کسی ٹاک شو میں جانے والے تھے؟''سعد نے کسی قدر حیرانی سے پوچھا۔

''تو تم نے کیا سوچا کہ ہم وہ روتے ہوئے چہرے اور ٹوٹے پھوٹے گھر دیکھنے بیٹھے ہیں.....ویسے بھی تم گھر میں موجود رہو تو تمھیں کچھ پتا ہونا۔اس live show کے لیے تو کل رات ہی ڈیڈ کو invite کر لیا گیا تھا.....اچھا اب اور کچھ مت پوچھنا۔ مجھے دیکھنا ہے کہ ڈیڈ کیسا بولتے ہیں اور وہ ''ڈونیشن'' کتنی دیتے ہیں'' اس نے نظریں ٹی وی سکرین پر جما دیں۔

''تا کہ کل تمھیں اپنی فرینڈز پر رعب جمانے کا ایک اور موقع مل جائے.....ڈونیشن ڈیڈ دیں گے اور اتراتی تم پھرو گی....'' اس نے اسے چڑاتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی سخت سا جواب دیتی بیگم رعنا بول پڑیں۔

''سعد!.....سٹاپ اٹ ناؤ .....'' انھوں نے تنبیہ کی تو وہ کندھے اچکا کر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''یہ لاکھوں روپے کی ڈونیشن دے کر ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر رہے ہیں کیوں کہ ان کا مسئلہ پیسے نہیں، زندگی ہے جو لمحہ بہ لمحہ ان پر تنگ ہوتی جا رہی ہے.....میرے خیال میں اتنے بڑے disaster سے تو وہ لوگ بچ گئے ہیں لیکن آگے جو مسائل ان کے سامنے پہاڑ کی طرح کھڑے ہیں ان سے نمٹنا سب سے مشکل کام ہے....بھوک ، بیماری ، پیاس ، گھر.....اگر ان مسائل کا جلد ہی کوئی حل نہ ڈھونڈا گیا تو مجھے ڈر ہے کہ ہم کچھ اور پیاروں کو نہ کھو بیٹھیں.....'' کمپئیر کی کسی بات کے جواب میں احسن شیرازی نے بڑے ہی بارعب انداز سے کہا جس پر ہانیہ کے ساتھ ساتھ بیگم رعنا اور سعد کی گردنیں خود بخود تن گئیں۔

ایک گھنٹے بعد ٹاک شو ختم ہوا تو ہانیہ نے ٹی وی کا والیم کم کر دیا۔

''ویسے ڈیڈ کتنے گریس فل اور ڈیشنگ لگ رہے تھے آج .....اور وہ نینا کے ڈیڈ کتنا بورنگ کلر تھا نا ان کے سوٹ کا اور کیسے اکڑ کر بیٹھے ہوئے تھے لیکن جب ڈیڈ نے ڈونیشن انا ؤنس کی تو کیسے بے چین ہو کر پہلو پر پہلو بدل رہے تھے....'' ہانیہ نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔

''یس مائی سویٹ ہارٹ!.....یہی تو خاص بات ہے احسن میں کہ حالات خواہ کیسے بھی ہوں وہ اپنا فائدہ نکالنا جانتے ہیں.....اسی لیے تو احسن شیرازی ایک کامیاب بزنس مین ہے کیونکہ اسے بزنس کرنے کا گر آتا ہے.....بزنس میں کبھی کبھی ''بلائنڈ گیم'' کھیلنی پڑتی ہے اور پھر چند لاکھ دے کر کروڑوں کا فائدہ ہو جاتا ہے'' وہ بڑے تفاخر سے اسے بتا رہی تھیں۔

''لیکن مام! ڈونیشن کیسے کروڑوں کے فائدے میں بدلے گی'' اس نے کسی قدر حیرانی

سے پوچھا۔

''اسے کہتے ہیں political trick .....سیاسی چال.....'' ان کے ہونٹوں پر عیارانہ مسکراہٹ تھی۔

''بٹ مام! .....ڈیڈ پولیٹکس میں تو نہیں....تو پھر.....'' وہ الجھ سی گئی۔

''سویٹ ہارٹ! یہ تم ابھی نہیں سمجھو گی'' انھوں نے پیار سے اس کی طرف دیکھا تو وہ محض سر ہلا کر رہ گئی۔

''ہے ہانی!.....یہ نیوز دیکھ .....'' اچانک سعد نے پکارا تو ہانیہ کے ساتھ ساتھ بیگم رعنا بھی ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''ایک آٹھ سالہ بچی کو چھتیس گھنٹے بعد ملبے سے زندہ نکال لیا گیا''

''مام!.....is it possible?'' ہانیہ نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''possiblities تو کہتی ہیں کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن.....''

اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتیں پاس ہی پڑے فون کی گھنٹی بج اٹھی اور وہ فون پر باتوں میں مصروف ہو گئیں۔

ہانیہ کچھ زیادہ ہی متجسس ہو رہی تھی اس لیے انھیں فون پر مصروف دیکھ کر وہ سعد سے پوچھنے لگی۔

"what do you think bro?"

''میرا نہیں خیال کہ ایسا possible ہے.....اچھا چلو ایک منٹ کے لیے ہم مان لیتے ہیں کہ بچی زندہ نکل آئی تو پھر بہت سارے سوال اٹھتے ہیں.....چھتیس گھنٹے تک بچی ملبے کے اندر دبی ہوئی تھی.....اس تک آکسیجن کیسے جا رہی تھی اور اگر جا بھی رہی تھی تو خوف،

تنہائی ، بھوک ، پیاس سے لڑتے ہوئے اس کا اتنی دیر تک زندہ رہنا it,s quite unnatural .....ایکچوئیلی یہ لوگ صرف دکھانا چاہتے ہیں کہ وہاں کام کیا جا رہا ہے.....اینڈ دیٹس اٹ.....'' اس نے صورتحال کا تجزیہ کر کے اپنا نقطہ نظر بیان کیا۔

''یس یو آر رائٹ .....واقعی کوئی logic تو ہو.....یہ میڈیا بھی نا'' وہ فوراً ہی قائل ہوگئی۔

بوڑھی ملازمہ چائے کے لوازمات سے سجی ٹرالی دھکیلتے ڈرائینگ روم کے دروازے میں ہی کھڑی رہ گئی۔ان سب کی باتوں نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور کچھ سوچتی ہوئی ٹرالی دھکیلتی اندر آ گئی۔ٹرالی چھوڑ کر ایک تاسف بھری نظر ان پر ڈال کر وہ خاموشی سے پلٹ گئی۔

وہ ابھی چائے ہی پی رہے تھے کہ احسن شیرازی بھی چلے آئے۔بیگم رعنا ابھی تک فون پر مصروف تھیں۔

''ڈیڈ!'' ہانیہ نے ہاتھ میں پکڑا کپ واپس ٹرالی پر رکھا اور تقریباً بھاگتی ہوئی ان کے سینے سے لپٹ گئی۔

''کیسی ہے؟.....my sweet little angle!'' انھوں نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے پوچھا۔

''فسٹ کلاس'' اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''چائے.....ڈیڈ؟''

گڈ .....کیوں کہ اس وقت مجھے اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے''انھوں نے ٹرالی کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر اسے ساتھ لیے صوفے پر آ کر بیٹھ گئے۔

''how was the show dad?'' سعد نے ان کے بیٹھتے ہی پوچھا جبکہ

ہانیہ ان کے لیے چائے نکالنے لگی۔

''very tiredy .....ایسے شوز پبلیسٹی تو دیتے ہیں لیکن.....'' انھوں نے بات ادھوری ہی چھوڑ دی کیوں کہ بیگم رعنا فون رکھ چکی تھیں۔

''تو احسن شیرازی نے میدان مار لیا..... پورے سرکل میں تمھاری ہی ڈونیشن کی دھوم ہے'' بیگم رعنا نے توصیفی انداز میں ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''احسن شیرازی جب میدان میں اترتا ہے تو صرف جیتنے کے لیے'' ان کا لہجہ تفاخر سے بھرپور تھا۔

''that,s true'' وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''تم کہاں چل دیئے؟''

''ایک گھنٹے بعد ہماری این۔جی۔او کی میٹنگ ہے.....اسی زلزلے کے سلسلے میں فنڈز وغیرہ اکٹھا کرنے کے لیے.....'' انھوں نے یوں کہا جیسے کوئی ناپسندیدہ کام کرنے پر انھیں مجبور کر دیا گیا ہو۔

''ناٹ اگین .....اب پتا نہیں یہ سب کچھ کب تک چلے گا.....یہ چھوٹے لوگ.....نہ تو ان کی تعداد کم ہوتی ہے اور نہ پرابلم ہی.....'' انھوں نے نخوت سے ناک چڑھا کر کہا۔

''اتنی جلدی تو ختم ہونے والا نہیں یہ سب.....جتنا بڑا disaster ہوا ہے.....دو، تین سال تو کہیں نہیں گئے.....اتنا وقت تو لازمی لگے گا.....نئے سرے سے شہر آباد کرنا، کوئی آسان کام نہیں'' بیگم رعنا نے اپنی رائے دی۔

''who cares.....ہمارا جو کام تھا ہم نے کر دیا۔اب حکومت جانے اور یہ لوگ..... any way تم جاؤ۔میں آج ریلیکس کروں گا'' انھوں نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لی۔بیگم رعنا تیار ہونے اپنے

کمرے کی طرف چل دیں۔

''ڈیڈ!.....چائے....'' ہانیہ نے کپ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ سیدھے ہو بیٹھے۔

''سعدیہ!.....چینل تو چینج کرو....

''I am fed up of all these things.

چائے کا کپ پکڑتے ہوئے ان کی نظر ٹی وی سکرین پر پڑی تو انھوں نے ناگوار لہجے میں کہا۔اس سے پہلے کہ سعد اٹھ کر ریموٹ پکڑتا، ہانیہ نے ریموٹ اٹھایا اور چینل بدل دیا۔اس چینل پر کوئی کامیڈی مووی چل رہی تھی اور وہ سب اسے دیکھنے میں مشغول ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

کیسا حرفِ وفا

سب ایک پل کی حقیقت
سب ایک پل کا سراب
دلوں میں ترکِ تمنا کا حوصلہ ہو اگر
تو کیسا حرفِ وفا!
اور کہاں کے خواب و گلاب!!
یہ کیسے دشتِ ندامت میں گھِر گئے اے جاں
کہ اک تو ترکِ تمنا کا حوصلہ بھی نہیں
اور اس پہ یہ بھی قیامت
اگر۔۔۔ بفرضِ محال

تمہاری راہ سے پھرنے کا حوصلہ بھی ملے!
پلٹ کے جائیں کہاں، گھر کا راستہ بھی ملے!!

پچھلے تین دنوں سے میں ہاسپٹل کے اس بیڈ پر پڑا ہوں۔ میری ایک ٹانگ پر پلاسٹر چڑھا ہوا ہے اور کندھے کی ہڈی میں فریکچر ہو جانے کی وجہ سے میں ایک بازو کو بھی ہلا نہیں سکتا۔ سر اور جسم کے باقی حصوں پر بھی معمولی چوٹیں آئی ہیں اس لیے پورے جسم پر ہی کہیں نہ کہیں بینڈج موجود ہے۔ باقی سب چوٹیں تو جلد ہی ٹھیک ہو جائیں گی لیکن ڈاکٹرز کے مطابق میری ٹانگ کی ہڈی ٹوٹنے کی وجہ سے پلاسٹر کھلنے کے بعد بھی میرا سیدھا کھڑا رہ پانا اب مشکل ہی تھا۔ شاید زندگی بھر اب مجھے ایک چھڑی کے سہارے ہی چلنا تھا۔ یہ شاک میرے لیے بہت بڑا تھا اور ابھی میں اس صدمے سے نکل بھی نہیں پایا تھا کہ مشعل نے یہ کہہ کر اپنا راستہ بدل لیا کہ وہ مجھ جیسے ادھورے انسان کے ساتھ زندگی بھر نہیں چل سکتی۔

مشعل نے میرے ساتھ جو کچھ کیا شاید میں اسی کا مستحق تھا۔ میرے ساتھ ہونے والا حادثہ، مشعل کی بے وفائی یہ سزا ہی تو تھی جو مجھے عائزہ کا دل دکھانے پر ملی تھی ورنہ عادل کا اچانک مجھے اسلام آباد میں ملنا اور پھر میرا اس کے ساتھ مظفر آباد جانا اور زلزلے کا آنا..... یہ محض اتفاق نہیں تھا۔ یہ سب کچھ تو اسی طرح لکھا گیا تھا۔ کتنی آسانی سے میں نے عائزہ سے کہہ دیا تھا کہ میں اب اس سے نہیں بلکہ مشعل سے محبت کرنے لگا ہوں..... ایک بار بھی میں نے عائزہ کے بارے میں نہیں سوچا اور سوچتا بھی کیسے اس وقت تو مشعل میرے اعصاب پر چھائی ہوئی تھی۔

مشعل سے میری ملاقات ایک دوست کے آفس میں ہوئی تھی۔ وہ وہاں ریسپشنسٹ تھی۔ اس کی بے انتہا خوبصورتی نے مجھے پہلی ہی ملاقات میں اپنی طرف راغب کر لیا تھا اور خوبصورتی اگر دعوت دے تو دل کو بہکنے سے روکنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

میں بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اکثر وہاں جانے لگا اور پھر ہماری ملاقاتیں بڑھتے بڑھتے ہر روز ہی ہونے لگیں۔

آج مشعل کا برتھ ڈے تھا اور میں اسے ڈنر کرانے بلیو ہیون لایا تھا۔ یہ اس کا سب سے فیورٹ ہوٹل تھا۔ ویٹر کو آرڈر لکھوانے کے بعد میں نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور رنگ نکال کر اپنی مٹھی میں دبالی۔

''مشعل! اپنا ہاتھ آگے کرو''

'' کیوں؟'' اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔

''پہلے کرو تو پھر بتاتا ہوں''

میں نے اصرار کیا تو اس نے اپنا بایاں ہاتھ آگے کر دیا۔ نرم و نازک مخروطی انگلیاں میں نے اپنے ہاتھ میں تھامیں اور دوسرے ہاتھ سے بڑے ہی پیار سے اس کی درمیانی انگلی میں ڈائمنڈ رنگ پہنا دی۔

''یہ ہماری جان کے لیے ایک چھوٹا سا تحفہ.....'' میں نے بہت آہستگی سے اس کے ہاتھ پر اپنے ہونٹ ثبت کر دیئے۔

''شہاب!.....کیا کر رہے ہیں..... پبلک پلیس ہے۔ کچھ تو خیال کریں.....'' اس نے جھینپ کر اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

''کمال ہے۔ برتھ ڈے وش کرنے کے لیے بھی پبلک پلیس کا خیال رکھنا پڑتا ہے'' میرا لہجہ ہلکی سی ناراضی لیے ہوئے تھا۔

''اچھا اب اپنا موڈ مت خراب کریں.....ہمیں آپ کا گفٹ اور انداز دونوں ہی بہت پسند آئے ہیں.....''

اس نے میری خفگی محسوس کر کے محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا

اور میں تو اس پر ویسے ہی فدا تھا۔اس کے یوں دیکھنے پر فوراً ہی ناراضی بھلا بیٹھا۔

''تو پھر میرا گفٹ مجھے کب مل رہا ہے؟'' میں نے نثار ہوتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اتنی جلدی بھی کیا ہے.....ذرا انتظار کیجیے.....ویسے بھی کہتے ہیں کہ انتظار کا ایک اپنا مزہ ہوتا ہے''

اس نے ایک ادا سے اپنے چہرے پر آئی ہوئی لٹ کو ہاتھ مار کر پیچھے کیا تو جتنی زور سے وہ لٹ ڈولی تھی، اس سے کہیں تیزی سے میرا دل دھڑکا تھا۔

''ہائے .....یہ انتظار کہیں ہماری جان ہی نہ لے لے'' میرے لہجے میں حسرتیں پنہاں تھیں۔

''تو اس کے ذمہ دار بھی تو آپ خود ہی ہیں نا.....اگر مجھے پہلے پتا ہوتا کہ آپ شادی شدہ ہیں تو میں کبھی آپ کی طرف قدم نہ بڑھاتی''

اس نے خفگی سے کہا۔

''لیکن مشعل میں نے تو صرف اس لیے جھوٹ بولا تھا کہ میں تمھیں کھونے سے ڈرتا تھا.....I just can't live without you'' میں نے فوراً ہی اپنی صفائی پیش کی۔

''جانتی ہوں .....لیکن میرے گھر والوں کو منانا آسان کام نہیں اور میں انھی کوششوں میں لگی ہوئی ہوں''

''اگر تم کہو تو میں بات کروں تمھارے گھر والوں سے .....ویسے بھی تم نے ابھی تک مجھے اپنے گھر والوں سے متعارف نہیں کروایا''

میں اس کی مشکل بھی سمجھتا تھا لیکن اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔

''نہیں.....اس کی ضرورت نہیں۔میں انھیں منا لوں گی۔تھوڑا وقت لگے گا لیکن آخر میری ضد کے آگے وہ مجبور ہو ہی جائیں گے.....

آپ پریشان مت ہوں ''

اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔اسی اثنا میں ویٹر نے ٹیبل پر کھانا سرو کرنا شروع کر دیا تو ہم دونوں خاموش ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

میں گھر پہنچا تو امی کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی حالانکہ وہ جلدی سونے کی عادی تھیں اور اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔آج میں کوئی لیکچر سننے کے موڈ میں نہیں تھا اور تادیر مشعل کے ساتھ گزری خوبصورت شام کے حصار میں رہنا چاہتا تھا۔

لیکن امی کے جاگتے ہوئے ان سے ملے بغیر اپنے کمرے میں چلے جانا مناسب نہیں تھا اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی میں ان کے کمرے میں چلا آیا۔عائزہ کو ان کے پاس بیڈ پر بیٹھے دیکھ کر میں ایک پل کے لیے دروازے میں ہی رک گیا۔اس کی ہنسی کی آواز نے میرے قدم خود بخود ہی روک لیے تھے۔آج نجانے کتنے دنوں بعد میں نے اسے یوں ہنستے ہوئے دیکھا تھا ورنہ وہ تو میرے سامنے اکثر چپ چاپ ہی رہتی تھی۔اس کی آنکھوں میں بے شک ہزاروں سوال مچلتے نظر آتے لیکن لب اکثر خاموش ہی رہتے تھے۔

''السلام علیکم امی!'' میں نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔میری آواز پر اس کی ہنسی ایکدم رک گئی۔

''وعلیکم السلام.....جیتے رہو.....آؤ کچھ دیر میرے پاس بیٹھو.....'' امی نے اپنے نرم اور پر شفقت لہجے میں کہا تو میں انکار نہ کر سکا اور بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔میرے

بیٹھتے ہی عائزہ اٹھ کر چلی گئی۔

''آپ کے جوڑوں کا درداب کیسا ہے؟''

''اب تو کافی بہتر ہے.....عائزہ روز رات کو مالش جو کرتی ہے.....اللہ اسے لمبی زندگی دے''

ان کے لہجے میں عائزہ کے لیے ڈھیروں پیار تھا اور میں خوامخواہ نظریں چرانے لگا۔

''میں جب بھی عائزہ کی طرف دیکھتی ہوں تو مجھے اس میں اپنا آپ نظر آتا ہے.....تمھارے ابو کے گزر جانے کے بعد تمھیں اور شاہینہ کو میں نے اکیلے ہی پالا ہے اور رب کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ شاہینہ بھی اپنے گھر میں خوش ہے اور تمھیں بھی ایک بہترین جیون ساتھی ملا ہے..... وہ ایک ماں، بہو اور بیوی کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے نبھا رہی ہے لیکن بیٹا! میں دیکھ رہی ہوں کہ دفتری کاموں میں الجھ کر تم اسے اور احمد کو نظر انداز کر رہے ہو.....کام کرو میں تمھیں کام سے نہیں روکتی لیکن اتنا کہ جس سے تمھاری گھریلو زندگی متاثر نہ ہو.....تمھاری اولین ترجیح تمھارا گھر اور یہ رشتے ہونے چاہئیں۔ امید کرتی ہوں کہ میں جو تمھیں سمجھانا چاہتی تھی تم سمجھ گئے ہو گے.....ویسے بھی ماشاءاللہ تم خاصے سمجھدار ہو.....''

انھوں نے بات اس انداز سے کی تھی کہ میں کچھ کہہ ہی نہیں پایا، بس سر جھکائے سنتا رہا۔ یہ امی کی شروع سے ہی عادت تھی انھیں جب بھی ہم دونوں بہن بھائی کو کوئی بات سمجھانی ہوتی تو اسی طرح ہمیں اپنے پاس بلا کر بٹھا لیتیں اور پھر اتنے پر شفقت انداز میں سمجھاتیں کہ نہ تو وہ ہمیں نصیحت لگتی اور نہ ڈانٹ ہی بلکہ ہم خود بخود اس بات پر عمل کرنا شروع کر دیتے۔ آج بھی ان کا انداز وہی تھا، بس میں بدل گیا تھا لیکن بچپن کی عادت اتنی پختہ ہو چلی تھی کہ میں ان سے اختلاف نہیں کر پایا بس خاموشی سے سب کچھ سن کر ان کے کمرے

سے نکل آیا۔

''کھانا کھالیں آ کر'' میں اپنے کمرے میں جانے ہی والا تھا کہ عائزہ کے پکارنے پر رک گیا۔ پلٹ کر دیکھا تو وہ ڈائینگ ٹیبل پر کھانا لگا رہی تھی۔

''میں کھانا کھا کر آیا ہوں'' میں بے رخی سے کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

رات کو دیر سے اور کھانا کھا کر آنا اب میں نے اپنا وتیرہ بنا لیا تھا لیکن پھر بھی وہ روزانہ مجھ سے کھانے کو ضرور پوچھتی تھی۔اس کی یہ عادت کبھی تو مجھے چڑا دیتی اور کبھی نادم کر دیا کرتی تھی لیکن ندامت کا یہ احساس بس وقتی ہوتا تھا کیوں کہ اس وقت میں پوری طرح مشعل کی محبت میں ڈوبا ہوا تھا اور اس کے حُسنِ جہاں سوز کے آگے مجھے کچھ اور نظر نہیں آتا تھا۔ یہاں تک کہ عائزہ کی شکوہ بھری آنکھیں، امی کا تنبیہی انداز اور احمد کی معصوم محبت بھی مجھے اپنی طرف نہیں کھینچتی تھی۔ میں تو بس سب کچھ بھلائے مشعل کی محبت میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

آج میں مشعل کے ساتھ شاپنگ مال میں موجود تھا۔ وہ اپنے لیے کچھ ڈریسز پسند کر رہی تھی۔ میں اسے دیکھنے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی ایک اچٹتی نظر اپنے آس پاس بھی ڈال لیتا تھا۔ اچانک مجھے لگا کہ میں نے عائزہ کی جھلک دیکھی ہے لیکن جب میں نے اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی تو وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ میں اسے اپنا وہم جان کر بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ چاہے ایک پل کے لیے ہی سہی لیکن میں نے اسے دیکھا ضرور تھا اور پھر وہ میری بیوی تھی، میں کم از کم اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ میں انھی سوچوں میں غلطاں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ مشعل کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''شہاب !.....کہاں گم ہیں آپ ۔میں اتنی دیر سے پوچھ رہی ہوں کہ یہ سوٹ کیسا لگ رہا ہے اور آپ ہیں کہ میری طرف دیکھ بھی نہیں رہے.....اگر آپ کا موڈ نہیں تھا تو مجھے پہلے ہی بتا دیتے.....ہم یہاں آتے ہی نہیں.....کم از کم مجھے یوں لوگوں کے سامنے شرمندہ تو نہ ہونا پڑتا.....'' مشعل نے غصے میں ہاتھ میں پکڑا سوٹ واپس رکھا اور باہر نکلنے لگی۔

''مشعل !.....ایک منٹ ۔میری بات تو سن لو.....'' میں بوکھلا کر اس کے پیچھے گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے واپس لے آیا۔

''چھوڑیں میرا ہاتھ '' اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''او کے بابا!او کے .....آئی ایم سوری.....تم خفا مت ہو۔چلو بتاؤ کون سا سوٹ پسند ہے تمھیں''میں اس کی خفگی سہہ ہی نہیں سکتا تھا،اس لیے فوراً اسے منانے لگا۔

''مجھے نہیں لینا کوئی سوٹ'' اس نے صاف انکار کر دیا۔

'' او کے مت لو لیکن کم از کم غصہ تو مت کرو.....چلو کہیں اور چلتے ہیں.....جیولری شاپ چلیں....؟'' میں جانتا تھا کہ جیولری اس کی کمزوری ہے لیکن آج میرا کوئی حربہ کام نہیں کر رہا تھا۔

''میں نے کہا نا مجھے کچھ نہیں لینا.....بس آپ مجھے گھر چھوڑ دیں'' اس نے کسی قدر تلخ لہجے میں کہا۔

'' کم آن مشعل !.....میں نے سوری تو کر دیا ہے اب اور کیا چاہتی ہو'' اس کے روڈ انداز پر میرا لہجہ بھی کچھ اکھڑا ہوا سا ہو گیا تھا۔

'' آپ تو یوں کہہ رہے ہیں جیسے سوری کہہ کر آپ نے مجھ پر کوئی احسان کیا ہے.....میں ایسے رویوں کی عادی نہیں.....''

وہ ایک خفگی بھری نظر مجھ پر ڈال کر تیز تیز قدم اٹھاتی شاپ سے باہر نکل گئی تو ناچار مجھے بھی اس کی تقلید کرنی پڑی۔

میں شاپنگ مال کے پارکنگ ایریا میں اپنی کار کے پاس پہنچا تو وہ بھی کار سے ٹیک لگائے وہیں کھڑی تھی۔ایک چھوٹی سی بات کو ایشو بنا کر وہ جس طرح ناراض ہوگئی تھی اس سے مجھے بہت دکھ پہنچا تھا۔اس کے اس روڈ انداز نے میری انا پر ایک کاری ضرب لگائی تھی۔اسی لیے میں نے اسے منانے کی دوبارہ کوشش نہیں کی، خاموشی سے جا کر کار میں بیٹھ گیا اور اس کی طرف کا دروازہ بھی کھول دیا۔مشعل کے گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے کار سٹارٹ کردی۔سارے راستے میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی جبکہ وہ خود اپنے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے کافی مضطرب نظر آ رہی تھی شاید وہ اپنے رویے پر پشیمان تھی۔اس نے کئی بار میری طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اسے موقع ہی نہیں دیا اور انتہائی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتے ہوئے گاڑی اس کے گھر کے سامنے لا کر روک دی۔گاڑی کے ٹائر بہت زور سے چرچرائے تھے اور وہ بھی اپنی سیٹ پر ایک جھٹکا کھا کر رہ گئی۔

''شہاب!.....'' اس نے پشیمان سے لہجے میں پکارا۔

''مشعل!.....بہتر ہوگا کہ ہم کل بات کریں''

میں نے اس کی آخری کوشش بھی ناکام بنادی۔وہ خاموشی سے گاڑی سے اتر گئی اور میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر گاڑی آگے بڑھادی۔

آج میں خلاف معمول آٹھ بجے ہی گھر پہنچ گیا۔عائزہ لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی اور اس کے سامنے ہی کارپٹ پر احمد اپنے کھلونے لیے بیٹھا تھا۔مجھے لاؤنج میں داخل ہوتے دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت کا بہت ہی گہرا تاثر ابھرا لیکن میں نظر انداز کرتا

آگے بڑھ گیا۔اسی وقت احمد نے بھی مجھے دیکھ لیا اور دوڑتے ہوئے آ کر میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

''پاپا..... پاپا.....'' وہ اپنی خوشی کا اظہار کر رہا تھا لیکن اس وقت میرا موڈ بہت خراب تھا اسی لیے میں نے نرمی سے اسے اپنی ٹانگوں سے الگ کیا اور قدم آگے بڑھا دیئے۔

''وہ آپ کی گود میں آنا چاہتا تھا'' اچانک عائزہ نے کہا تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔وہ تین سالہ احمد کو گود میں لیے ہوئے تھی۔

''جانتا ہوں.....لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ تم ہر بات میں مجھے ٹوکو.....'' میں نے کسی قدر تلخی سے کہا۔

''کہاں کا غصہ کہاں نکال رہے ہیں.....غلطی کسی کی اور قصوروار ٹھہرے ہم.....'' وہ ایک طنزیہ نظر مجھ پر ڈال کر احمد کو لیے امی کے کمرے میں چلی گئی اور میں نظریں جھکائے اپنے کمرے میں چلا آیا۔اس کی ایک نظر نے ہی مجھے احساس دلا دیا تھا کہ شاپنگ مال میں جسے میں نے دیکھا تھا وہ میرا وہم نہیں تھا بلکہ عائزہ ہی تھی۔

☆ ☆ ☆

میں شاور لیکر نکلا تو وہ بیڈ پر لیٹی احمد کو ہولے ہولے تھپک رہی تھی۔دو دن سے احمد بخار میں مبتلا تھا،اسی لیے اس کی طبیعت میں کچھ چڑچڑا پن سا آ گیا تھا اور وہ ہر وقت عائزہ کو اپنے پاس موجود دیکھنا چاہتا تھا۔اب بھی شاید وہ سوتے سوتے اٹھ بیٹھا تھا اور عائزہ اسے تھپک کر دوبارہ سلا رہی تھی ورنہ میری موجودگی میں وہ اب کم ہی کمرے میں نظر آتی تھی۔ خاص طور پر اس شاپنگ مال کے واقعے کے بعد سے تو انتہائی ضرورت کے علاوہ مجھ سے بات بھی نہیں کرتی تھی اور اس کی شاکی نظروں میں دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔اس لیے

میں بھی اسے نظر انداز کر رہا تھا۔ تیار ہو کر میں نے اپنے والٹ کی تلاش میں بیڈ پر نظریں دوڑائیں تو وہ نہیں تھا۔

''ایک تو اس گھر میں کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر نہیں ملتی'' میں خوامخواہ غصے میں آ گیا شاید یہ احساس ندامت تھا جو غصے کی صورت میں باہر آ رہا تھا۔ وہ اٹھی اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

''چیزیں تو اپنی جگہ پر ہی ہیں لیکن شاید آپ کی نظریں بدل گئی ہیں'' اس نے ڈریسنگ ٹیبل سے والٹ اٹھاتے ہوئے ایک نظر آئینے میں پڑنے والے اپنے عکس پر ڈالی اور دوسری مجھ پر اور پھر والٹ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے والٹ پکڑا تو وہ فوراً ہی پلٹ گئی۔

''تم مجھ سے ایک بار وہ سارے سوال کیوں نہیں پوچھ لیتی ہو جو ہر روز تمھاری آنکھیں پوچھتی ہیں'' میں نے کسی قدر چڑ کر کہا۔

اس کا یہ طنزیہ انداز مجھے بالکل پسند نہیں آیا تھا شاید اس لیے کہ یہ مجھ جیسے انا پرست مرد کی انا کو ٹھیس پہنچاتا تھا اور انا پر پڑنے والی ضرب بہت گہری ہوتی ہے۔

''سوال پوچھ کر کیا کروں گی .....جواب تو جب آپ دینا چاہیں گے، تب ہی دیں گے .....اور ویسے بھی اہمیت میرے سوالوں کی نہیں آپ کے جوابوں کی ہے .....اور میں آپ کے جوابوں کا انتظار کر رہی ہوں۔ دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ کیسے جواب ہوتے ہیں جو برسوں کی رفاقت کو محض سوال بنا کر چھوڑ دیتے ہیں .....'' اس نے پلٹ کر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور پھر فوراً ہی کمرے سے نکل گئی۔ لیکن میں بہت دیر کھڑا ان آنکھوں کو کھوجتا رہا جو آج بہت اداس اور ادھوری سی تھیں یا شاید بہت دنوں سے۔

☆ ☆ ☆

آج میں بہت خوش تھا۔ مشعل کے گھر والے ہماری شادی کے لیے مان گئے تھے اور آج کی پوری شام ہم نے ساحل سمندر پر چہل قدمی کرتے اور اپنے مستقبل کی پلاننگ کرتے گزاری تھی۔ مشعل کو گھر ڈراپ کر کے میں گھر پہنچا تو گیارہ بج رہے تھے۔ امی کے کمرے کی لائٹ بند تھی اور عائزہ صوفے پر آنکھیں موندے نیم دراز تھی۔ میرے آنے پر کھٹکے کی آواز سن کر وہ اٹھ بیٹھی۔ میں آج ہی اسے مشعل کے بارے میں سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے لیے کھانا لگانے اٹھتی، میں نے اسے روک دیا۔

''عائزہ! بیٹھو..... مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے'' میں نے ذرا سنجیدہ لہجے میں کہا تو وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں نے ہاتھ میں پکڑا بیگ سینٹر ٹیبل پر رکھا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی اور دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ٹھونسے، اس کی طرف سے رخ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''عائزہ!..... مجھے کسی سے محبت ہو گئی ہے'' میں نے لفظوں کو ذہن میں ترتیب دیتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد جب عائزہ نے کوئی سوال نہیں کیا تو میں نے خود ہی بات آگے بڑھا دی۔

''میں مشعل سے شادی کر رہا ہوں..... میں نے اسے تمھارے بارے میں بھی بتا دیا ہے اور اسے کوئی اعتراض نہیں..... ویسے تمھیں بھی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اس کے لیے علیحدہ سے فلیٹ لیا ہے اور وہ وہیں رہے گی..... تمھیں بتانا ضروری تھا لیکن میں چاہتا ہوں کہ امی کو اس بارے میں کچھ پتا نہ چلے تو بہتر ہے.....'' میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی اور میں اس سے نظریں چرا رہا تھا۔

''کچھ کہو گی نہیں.....'' اسے یوں گم صم دیکھ کر مجھے شدید ندامت کا احساس ہو رہا تھا۔

''کچھ کہنے سننے کو اب بچا ہی کیا ہے..... پانچ سال کے رشتے کو دھوکا دینے میں آپ

نے پانچ ماہ بھی نہیں لگائے تو کیا آج میرا کوئی بھی سوال آپ کو اپنے فیصلے سے روک پائے گا.....آپ مجھے نہیں سمجھ پائے لیکن میں نے آپ کو آپ سے زیادہ جانا ہے، زیادہ چاہا ہے.....آپ نے مجھ سے شادی تو کی لیکن نبھائی نہیں۔شادی کرنا آسان ہے لیکن اسے نبھانا بہت مشکل.....جایئے آپ اپنا فیصلہ نبھایئے اور میں اپنی محبت نبھاؤں گی.....'' اس نے گھمبیر لہجے میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اٹھ کر کچن میں چلی گئی لیکن اس کی آنکھوں کے بھیگے گوشے میری نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکے تھے۔

☆ ☆ ☆

میں اپنے بزنس کے سلسلے میں دو دن کے لیے اسلام آباد جا رہا تھا جہاں سے واپسی پر میں مشعل کے ساتھ کورٹ میرج کرنے والا تھا۔مشعل کو میں نے شادی کے جوڑے اور زیور کی خریداری کے لیے پیسے دے دیئے تھے تاکہ وہ ان دو دنوں میں اپنی شاپنگ مکمل کر لے۔میں اب مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

عائزہ میرا بیگ پیک کر رہی تھی۔احمد بیڈ پر بیٹھا میرے بیگ کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ آئینے کے سامنے کھڑے بالوں میں برش کرتے ہوئے میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد عائزہ پر بھی ایک اچٹتی نظر ڈال لیتا تھا۔میں اس کے چہرے پر کچھ کھوجنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہاں تو بس پتھریلی چٹانوں کی سی سختی کا تاثر منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔لگتا ہی نہیں تھا کہ اس چہرے پر کبھی کوئی جذبہ دھنک بن کر بکھرا بھی ہوگا۔عائزہ کا ردعمل میرے لیے بہت حیران کن تھا۔

''عائزہ!.....اس رات کو میں نے تم سے جو کچھ کہا.....تمھیں برا تو بہت لگا ہوگا'' میں نے بغور اس کے چہرے پر نظریں جمائے پوچھا۔اس کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر گزر گیا۔

''کیا کریں گے جان کر'' اس کے ہاتھ ایک پل کے لیے رکے اور وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔

''شاید کچھ نہیں.....لیکن پھر بھی جاننا چاہتا ہوں'' میں کیوں اصرار کر رہا تھا یہ میں خود بھی نہیں جانتا تھا۔

''برا لگا یا نہیں یہ تو میں خود بھی نہیں جانتی.....لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس دن میرا یقین ٹوٹ گیا۔ اگرچہ کچھ مہینوں سے آپ کے رویے میں آنے والی تبدیلی نے مجھے ایسی ہی کسی انہونی کا احساس دلا دیا تھا لیکن پھر بھی میں چاہتی تھی کہ یہ محض میرا وہم ہی ثابت ہو لیکن.....'' وہ کہتے کہتے ایکدم خاموش ہوگئی۔

''تمھیں مجھ پر غصہ نہیں آ رہا.....مجھ سے پوچھو گی نہیں کہ میں کیوں ایسا کرنے جا رہا ہوں .....'' مجھے اس کا رویہ ابنارمل سا لگا۔

''یہ سوال تو آپ کو خود اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے.....کیوں کہ آپ سے یہ سوال پوچھنے کا حق تو میں نے اسی دن کھو دیا تھا جب آپ نے ہمارے رشتے کو دھوکا دیتے ہوئے یہ نیا رشتہ قائم کیا تھا.....اب آپ صرف میرے بیٹے کے باپ ہیں اور کچھ نہیں'' اس نے بیگ کی زپ بند کی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''لیکن تم میری بیوی بھی تو ہو'' میں نے تحیر سے اسے دیکھا۔

''بالکل اسی طرح جیسے آپ میرے شوہر ہیں.....صرف نام کے'' اس نے جتاتے ہوئے میری طرف دیکھا اور احمد کو اٹھائے کمرے سے نکل گئی اور میں ہکا بکا کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔

☆ ☆ ☆

عائزہ کی باتوں نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔اس کا ردعمل اتنا شدید ہوگا،اس کا مجھے تھوڑا بہت اندازہ تو تھا۔اسلام آباد میں اپنے کام کے دوران بھی مجھے عائزہ کی باتیں ڈسٹرب کرتی رہیں۔میں مشعل کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا لیکن عائزہ کا چہرہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا۔میں اپنی کیفیت کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔اسی الجھن میں گھرے میری ملاقات عادل سے ہوگئی۔عادل اور میں نے یونیورسٹی میں بہت سا اچھا وقت ساتھ گزارا تھا لیکن ماسٹرز کمپلیٹ ہوتے ہی وہ اپنے شہر واپس لوٹ گیا تو کبھی دوبارہ ملاقات نہ ہوسکی لیکن اتنے برسوں بعد اس سے مل کر میں تھوڑی دیر کے لیے اپنی الجھن بھول گیا تھا۔وہ اسلام آباد میں ہی جاب کر رہا تھا اور اب تین ہفتوں کی چھٹی لیکر اپنے شہر مظفر آباد جا رہا تھا۔عید کے فوراً بعد اس کی شادی تھی۔اس نے زبردستی مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کر دیا اور میں اس کے محبت بھرے اصرار کو رد نہ کر سکا۔

عادل نے اگلے دن صبح گیارہ بجے کی بس سے جانا تھا لیکن چونکہ اب میں بھی اس کے ساتھ جا رہا تھا اور میں نے کبھی بس سے سفر نہیں کیا تھا،اس لیے تایا جی کے گھر فون کر کے کزن سے جیپ منگوالی اور ہم دونوں صبح چھ بجے کے قریب اسلام آباد سے روانہ ہو گئے۔یونیورسٹی کے دنوں کو یاد کرتے،گپیں ہانکتے سفر کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ابھی ہم مظفر آباد سے دور ہی تھے کہ اچانک جیپ کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔میں اور عادل اپنی اپنی سیٹوں پر اچھل کر رہ گئے۔ابھی ہم سنبھل نہیں پائے تھے کہ بہت زوردار اور متواتر جھٹکے لگنے لگے جن کے باعث میرا گاڑی کو قابو میں رکھنا مشکل ہو گیا۔

''شہاب!.....انجن بند کر دو۔زلزلہ بہت شدید لگتا ہے.....''

عادل کی چیختی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی لیکن اس سے پہلے کہ میں انجن بند کرتا،جیپ ایک زوردار جھٹکا کھا کر الٹ گئی۔ہم اس وقت جس راستے سے گزر رہے تھے

اس کے ایک طرف کی سطح ڈھلوان تھی۔ جیپ الٹ کر ڈھلوانی سطح کے قریب ایک خاردار درخت سے الجھ گئی۔ جیپ الٹنے سے جو جھٹکا لگا تو عادل اچھل کر جیپ سے باہر جا گرا۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑا تا کہ اسے گہری کھائی میں گرنے سے روک سکوں اس کوشش میں میری ایک ٹانگ سٹیئرنگ کے درمیان بری طرح پھنس چکی تھی اور میں کوشش کے باوجود اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہل پایا۔ یوں عادل تو گہری کھائی میں گرنے سے بچ گیا مگر اس اچانک حادثے نے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ماؤف کر کے رکھ دیں۔ مجھے ٹانگ اور کندھے میں شدید درد محسوس ہو رہا تھا جو آہستہ آہستہ بڑھتا چلا گیا۔ درد میری برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا اور پھر میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں بے ہوش ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

بے ہوشی کے بعد جب پہلی بار میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ہاسپٹل کے بیڈ پر پایا۔ کمرے میں عائزہ بھی موجود تھی۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو کندھے میں درد کی ایک تیز لہر اٹھی اور میں کراہ کر رہ گیا۔

''لیٹے رہیے.....آپ کو آرام کی ضرورت ہے'' عائزہ نے جلدی سے میرے قریب آ کر کہا۔ بے اختیار اس کا ہاتھ میرے ماتھے کی جانب بڑھا لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے بہت غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں دکھ اور بے بسی کا بہت ہی گہرا تاثر جھلک رہا تھا۔

''کچھ نہیں'' وہ رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

''امی نہیں آئیں؟'' میں جانتا تھا کہ وہ میرے لیے پریشان ہے لیکن اپنی پریشانی مجھے دکھانا نہیں چاہتی اسی لیے میں نے بھی بات پلٹ دی۔

''امی اور احمد تایا جی کے گھر ہیں.....وہ تو کب سے آنا چاہ رہی ہیں۔میں نے ہی منع کر دیا تھا کہ خوامخواہ یہاں بیٹھ کر پریشان ہوں گی....اب آپ کو ہوش آ گیا ہے۔میں انھیں فون کر کے آتی ہوں.....'' وہ کہہ کر جانے لگی تو میں نے بے اختیار اسے پکارا۔

''عائزہ!.....وہ.....'' میں نے اسے روک تو لیا تھا لیکن اب سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کہوں۔میری اس جھجک کا اس نے غلط مفہوم نکال لیا۔

''مشعل ابھی نہیں پہنچی یہاں لیکن کل صبح تک آ جائے گی.....اس کا فون آیا تھا آپ کے موبائل پر۔میں نے اسے آپ کے ایکسیڈنٹ کا بتا دیا ہے.....''

وہ کہہ کر تیزی سے کمرے سے نکل گئی اور میں اسے یہ بھی نہیں بتا پایا کہ میں تو اس کا حال جاننا چاہتا تھا۔اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس سے دور رہ کر میں نے سب سے زیادہ اس کے بارے میں ہی سوچا ہے لیکن شاید اب کچھ بھی کہنے کا وقت گزر چکا تھا۔مشعل ہمارے درمیان ایک دیوار بن کر کھڑی تھی اور شاید یہ دیوار اب ہمیشہ کے لیے تھی۔

☆ ☆ ☆

مشعل اگلے دن آئی ضرور لیکن صرف یہ بتانے کہ اب وہ میرے ساتھ نہیں چل سکتی شاید وہ مجھ سے پہلے میرے ڈاکٹر سے مل کر آئی تھی۔جس نے میری ٹانگ پر پلستر چڑھایا تھا۔اسے آج میں ادھورا لگ رہا تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ عائزہ کے بغیر میں کل بھی ادھورا تھا اور ہمیشہ ادھورا ہی رہوں گا۔جس جسمانی ادھورے پن سے ڈر کر وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی وہی ادھورا پن تو اس نے پہلے اپنے لیے منتخب کر لیا تھا۔فرق صرف اتنا تھا کہ تب

میری روح ادھوری رہتی اور شاید اس کے لیے وہ ادھورا پن زیادہ معنی نہیں رکھتا تھا لیکن یہ سب کچھ تب مجھے کہاں پتا تھا۔ میں تو بس ظاہری چمک دمک کے پیچھے بھاگا چلا جا رہا تھا، بنا کچھ سوچے سمجھے لیکن ہاسپٹل میں گزرے یہ تین دن مجھے اپنی پہچان کرا گئے۔ خود اپنے آپ سے متعارف ہونے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں تو اب تک خود کو ہی نہیں جان پایا تھا، خود اپنے ہی جذبوں سے بے خبر تھا.....اور اب جب اپنے آپ سے ملاقات ہوئی تو میں نے جانا کہ میں کیا کھونے جا رہا تھا۔ خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی زندگی کو دور کر رہا تھا۔ آنکھوں سے ظاہری چمک دمک کا پردہ ہٹا تو ہر چیز نکھری اور خوبصورت معلوم ہو رہی تھی اور شاید یہی احساس میری آنکھوں سے خوشی بن کر چھلک رہا تھا۔ احساس جاگا تو میرا دیکھنے کا انداز بھی بدل گیا۔ میرے اندر ہونے والی اس تبدیلی کا احساس شاید عائزہ کو بھی ہو رہا تھا اسی لیے تو وہ مجھ سے نظریں ملا کر کم بات کرتی تھی۔

آج بھی میں صبح سے اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن وہ مجھے بات کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں دے رہی تھی مزید یہ کہ ہر تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی ملاقاتی چلا آتا۔ امی اور احمد مجھ سے مل کر واپس جا رہے تھے کہ وہ بھی ان کے پیچھے چل دی۔ موقع غنیمت جان کر میں نے فوراً اسے آواز دی۔

''عائزہ!.....'' میرے پکارنے پر امی نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور پھر باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔ عائزہ بھی خاموشی سے واپس پلٹ آئی۔

''جی!.....'' اس نے بیڈ کے پاس کھڑے رہ کر پوچھا۔

''بیٹھ تو جاؤ.....کیا میں اب اتنا اجنبی ہو گیا ہوں کہ تم تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھ بھی نہیں سکتیں'' اس کے یوں اجنبی انداز نے مجھے بہت دکھ پہنچایا تھا حالانکہ اس کا ذمہ دار بھی میں خود ہی تھا لیکن شاید ہم مردوں کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے کہ ہم چاہے جتنی غلطیاں

کریں لیکن ہمیشہ اپنی بیویوں سے یہی امید رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں معاف کر دیں، چاہے غلطی کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔

میرے کہنے پر وہ بیٹھ تو گئی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

''عائزہ!.....کیا میرے پاس واپسی کا کوئی راستہ ہے.....؟''میں نے بغیر کسی تمہید کے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا تو اس نے نظریں جھکا لیں۔کچھ دیر ہم دونوں کے بیچ خاموشی حائل رہی جسے میں نے ہمت کر کے توڑا۔

''تمھاری اس خاموشی کو میں کیا سمجھوں .....میں تو آج تک تمھیں نہیں سمجھ پایا تو تمھاری خاموشی کو کیا سمجھوں گا.....'' میں نے بے بسی سے لب کاٹے لیکن وہ اب بھی سر جھکائے اور ہتھیلیوں پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔بالکل پتھر کی ایک مورتی کی طرح۔

''عائزہ!میں مانتا ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے لیکن.....''

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس نے چونک کر سر اٹھایا اور غصے سے کہا ''غلطی .....صرف غلطی .....آپ نے میرا اعتبار توڑا ہے.....میری محبت کا خون کیا ہے.....ہمارے رشتے کو دھوکا دیا ہے.....ایک بیٹے کو اپنے باپ سے دور کیا ہے.....اتنے سارے گناہ کرنے کے بعد کتنی آسانی سے آپ نے اسے غلطی کا نام دے دیا.....شادی کے اس رشتے سے باہر قدم رکھتے ہوئے کیا آپ نے ایک بار بھی سوچا میرے بارے میں.....ہمارے بارے میں.....آپ نے تو کہہ دیا کہ مجھے کسی سے محبت ہوگئی ہے لیکن اس محبت کو کیسے بھول گئے جو آپ سے پچھلے پانچ سالوں سے شادی کے رشتے میں جڑی لڑکی آپ سے نبھا رہی ہے.....''

وہ آنسوؤں سے لبریز آنکھیں لیے میری طرف دیکھ رہی تھی اس وقت اس کے دکھ کی داستان اس کے چہرے پر رقم تھی۔جسے میں پتھر کہہ رہا تھا وہ تو صرف ایک خول تھا جو اس

نے خود کو مضبوط ظاہر کرنے کے لیے اپنے اوپر چڑھا رکھا تھا ورنہ اندر سے تو وہ بکھر کر ریزہ ریزہ ہو چکی تھی۔

''مجھے معاف کر دو عائزہ!.....میں بہک گیا تھا.....بھٹک گیا تھا.....مجھے معاف کر دو.....'' اس کی یہ حالت دیکھ کر میں خود بھی ٹوٹ گیا تھا اور کب آنسو گالوں پر لڑھک آئے، مجھے پتا بھی نہیں چلا۔

''معاف تو میں آپ کو کر دوں گی اس لیے نہیں کہ معاف کرنا ہم عورتوں کی مجبوری ہوتی ہے بلکہ اس لیے کہ محبت کا ظرف بہت بڑا ہوتا ہے اور میں کم ظرفی کا مظاہرہ کر کے اپنی محبت کی توہین نہیں کر سکتی....اور ہاں.....میں نے آپ کو معاف تو کر دیا ہے پر شاید اب ساری زندگی آپ پر اعتبار نہ کر سکوں.....اور اعتبار کے بغیر صرف رشتہ ہی نہیں بلکہ محبت بھی ادھوری ہے.....اور یہ بات تو آپ مجھ سے بھی بہتر جانتے ہیں.....'' اس نے پُر یقین لہجے میں کہتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں چاہ کر بھی اسے روک نہیں پایا۔

''شاید اب ہمیں یونہی ندی کے دو کناروں کی طرح زندگی بھر ساتھ ساتھ چلنا ہے۔ ایسے کنارے جو کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے.....کل جس رشتے کو میں ٹھوکر مار کر آگے بڑھا تھا، آج جب اسی رشتے نے مجھے ٹھوکر ماری تو احساس ہوا کہ تکلیف کیا ہوتی ہے..... درد کیا ہوتا ہے.....'' میں نے تھکے تھکے سے انداز میں آنکھیں موند لیں۔

☆ ☆ ☆

سرپرائز

سرمئی بادلوں سے ڈھکا آسمان اور دور پہاڑی کے دامن میں چھپا سورج، جس نے زرد اور نارنجی شعاعوں سے آسمان کے اس مخصوص حصے کو ڈھک رکھا تھا۔ تاریکی میں مدغم ہوتی اس روشنی میں پرندے بھی اپنے گھونسلوں میں لوٹ رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہر چیز محوِ سفر ہے..... ہر ایک کو اپنی منزل پر پہنچنے کی جلدی ہے۔

''کتنی عجیب بات ہے نا کہ شام ہوتے ہی پرندے تو اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں لیکن انسان..... انسان نہیں لوٹتے..... پتا نہیں راستے کے یہ پڑاؤ صرف انسانوں کے قدموں کو ہی زنجیر کیوں کرتے ہیں..... انسان ہی کیوں راستہ بھولتے ہیں، کبھی کوئی پرندہ راستہ کیوں نہیں بھولتا.....'' چھوٹی سی پہاڑی پر درخت سے ٹیک لگا کر آسمان پر نظریں جمائے اس نے کہا۔

''پرندے بھی راستہ بھولتے ہیں شائنزے!..... بس فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں

ان بے زبانوں کی اپنی مرضی شامل نہیں ہوتی....'' گل نے اسے افسردہ دیکھ کر نرمی سے کہا۔

''اور انسان اپنی مرضی سے راستہ بھولتا ہے.....ہے نا....'' اس نے ایکدم اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم اتنا مت سوچا کرو....جتنا سوچو گی اتنی ہی الجھتی چلی جاؤ گی...''

''کیسے نہ سوچوں گل!.....کیسے.....میری تو ہر سوچ بس ایک نام پر آ کر ٹھہر گئی ہے۔ ہر روز خود سے ایک ہی سوال کرتے کرتے تھک چکی ہوں میں اور جب چاچا چاچی کی بھیگی آنکھیں دیکھتی ہوں تو ڈر لگتا ہے کہ جو انسان اپنے ماں باپ کی آنکھوں کو انتظار سونپ کر دور پردیس جا بیٹھا ہے، اسے اگر ان کی محبت نہیں کھینچتی تو میری.....'' وہ بے بسی سے کہتے کہتے سسک اٹھی۔

''جب ساری کوششیں بے کار ہو جائیں تو خود کو موجوں کے سپرد کر دینا چاہیے.....کیا خبر کوئی موج کنارے تک ہی لے آئے.....ویسے بھی اگر وہ اب تک نہیں لوٹا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ لوٹے گا ہی نہیں۔ ظاہری چمک دمک کی کشش بہت تیز لیکن وقتی ہوتی ہے اور پھر اتنی ساری محبتوں سے وہ زیادہ دیر تک بھاگ نہیں سکے گا، اسے واپس لوٹنا ہی پڑے گا.....'' گل نے یقین سے پر لہجے میں کہتے ہوئے نرمی سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''میں نے کہیں پڑھا تھا کہ بہت بدنصیب ہوتا ہے وہ انسان جس کا انتظار کرنے والا کوئی نہ ہو اور میں اس کے حصے میں یہ بدنصیبی نہیں آنے دینا چاہتی.....ڈرتی ہوں اگر اس نے لوٹنے میں دیر کر دی تو کہیں.....'' جملہ مکمل کرنے کی اس کی ہمت نہیں ہوئی تو وہ خاموش ہو گئی لیکن اس کی حسرت بھری نظریں افق پر نارنجی اور زرد شعاعوں پر ٹکی تھیں، جن پر آہستہ آہستہ تاریکی کا پردہ چھا رہا تھا۔

''کچھ ہوا ہے کیا شائنزے.....؟''اس کا لہجہ آج کچھ زیادہ ہی بکھرا ہوا تھا اس لیے وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

''ہا.....بھابھی نے امی سے بات کی ہے.....اپنے بھائی کے لیے.....'' شائنزے نے نظریں جھکائے رک رک کر کہا۔

''کیا.....لیکن بھابھی تو اچھی طرح جانتی ہیں کہ تم مہروز سے منسوب ہو.....پھر وہ کیسے یہ بات کر سکتی ہیں.....'' اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

''کاش یہ بات مہروز کو بھی یاد ہوتی'' اس نے ہتھیلی پھیلائے اس پر نظریں جما کر کہا۔

''پھر ممانی نے منع کر دیا نا بھابھی کو....'' اس کے بھیگے لہجے کو نظر انداز کر کے اس نے جلدی سے پوچھا۔

''امی نے کچھ وقت مانگا ہے سوچنے کے لیے''

''اور ماموں....؟'' وہ اب بھی بے یقین تھی۔

''بابا بھی اس فیصلے میں امی کے ساتھ ہیں'' شائنزے نے تھکے تھکے سے انداز میں درخت کے تنے سے سر ٹکا دیا۔

''چھوٹی مامی نے کچھ نہیں کہا''

''چاچی چاچا کو کچھ کہنے کے قابل ہی کہاں چھوڑا ہے مہروز نے.....جب سے یہ بات ہوئی ہے چاچی کی آنکھیں تو ہر وقت بھیگی ہی رہتی ہیں اور مجھے دیکھ لیتی ہیں تو ان کے آنسو تھمنے میں ہی نہیں آتے.....وہ تو رو کر اپنا دل ہلکا کر لیتی ہیں میں تو وہ بھی نہیں کر سکتی، اسی لیے کوشش کرتی ہوں کہ کم سے کم ان کے کمرے میں جاؤں.....''

نہ چاہتے ہوئے بھی دو آنسو گالوں پر لڑھک آئے تھے جنھیں اس نے جلدی سے ہتھیلی کی پشت سے پونچھ ڈالا لیکن گل نے پھر بھی دیکھ لیا۔

''اگر تم کہو تو میں امی سے بات کروں کہ وہ بڑے ماموں سے بات کریں....'' گل نے اس کی حالت کے پیش نظر ایک ہلکی سی امید کے سہارے کہا۔

''کوئی فائدہ نہیں.....تمہیں پتا تو ہے کہ امی اور پھوپھو کی بالکل نہیں بنتی.....پھوپھو کے بات کرنے سے بات بگڑ بھی سکتی ہے۔ابھی تو امی نے وقت مانگا ہے پھر کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ضد میں آ کر فوراً شادی ہی کروادیں میری'' اس نے خوفزدہ ہو کر فوراً ہی اسے منع کر دیا۔

''اچھا ٹھیک ہے....تم پریشان نہ ہو۔سب ٹھیک ہو جائے گا.....اب چلیں۔شام گہری ہو رہی ہے۔گھر والے پریشان ہو جائیں گے'' گل نے ایک گہرا سانس بھر کر اٹھتے ہوئے کہا تو وہ بھی بوجھل سے انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

''لوٹ آؤ مہروز! اس سے پہلے کہ وقت ہمارے درمیان ایسی خلیج حائل کر دے کہ جدائی ہمارا مقدر بن جائے'' شائنزے نے ایک الوداعی نظر آسمان پر ڈالتے ہوئے سوچا اور پھر گل کے پیچھے چل پڑی۔

☆ ☆ ☆

ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔وہ کافی کا مگ تھامے کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔بوندیں کھڑکی کے شیشے پر گرتی بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔بے اختیار ہی اس کا دل چاہا تھا کہ وہ ان بوندوں کو چھو کر محسوس کرے اور دل کی اس خواہش کے آگے اس نے فوراً ہی ہتھیار بھی ڈال دیئے تھے۔کھڑکی کھلتے ہی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے آ کر ٹکرایا تھا۔اسے اپنے چہرے پر نمی کا احساس ہو رہا تھا لیکن اس نے پھر بھی کھڑکی بند نہ کی بلکہ ایک گہرا سانس بھر کر اس ٹھنڈک کے احساس کو اپنے اندر اتارنے لگا اور شاید یہ موسم کا ہی اثر تھا کہ آج نجانے کتنے عرصے بعد ماضی کے کئی خوبصورت لمحے اس کی آنکھوں میں اترنے لگے تھے اور اس نے بے اختیار آنکھیں موند لیں۔لمحوں کا عکس اس کے چہرے پر

خوشی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ بن کر خود بخود ابر آیا تھا۔

''خیریت؟.....آج بہت خوش نظر آ رہے ہو.....ویسے یہ خوشی صرف واپس جانے کی ہے یا کوئی اور بات ہے؟'' عادل نے اسے کھڑکی کے پاس کھڑا دیکھ کر کہا اور خود کتاب ہاتھ میں پکڑے صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔

''کیا یہ کافی نہیں کہ میں خوش ہوں'' عادل کی آواز نے خیالوں کا تسلسل توڑ دیا تو اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول دیں لیکن دھیمی سی مسکراہٹ اب بھی چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔

''کافی تو ہے.....لیکن.....'' اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ کر کتاب کھول لی۔

''لیکن پھر بھی جاننے کی خواہش ہے.....خواہش.....ہا.....یہ ہماری کبھی نہ ختم ہونے والی خواہشیں ہی ہیں نا جنھوں نے ہمیں پچھلے آٹھ سالوں سے اس اجنبی شہر سے باندھ رکھا ہے، ورنہ لندن جیسے شہر میں اس ایک کمرے کی گھٹن زدہ فضا میں قید ہم کیسے جیتے رہے ہیں....انھی خواہشوں کی بدولت.....پیسا، بہت سا پیسا کمانے کی دھن ہم پر ایسی سوار ہوئی کہ اس کے پیچھے بھاگتے بھاگتے ہم کب اپنوں سے دور ہوتے چلے گئے، پتا ہی نہیں چلا'' وہ ایک گہری سانس بھر کر اس کی طرف مڑا اور کھڑکی کے پٹ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا بات ہے.....آج بڑے کڑوے سچ بول رہے ہو.....لگتا ہے کافی کچھ زیادہ ہی کڑوی ہے'' اس نے مبہم سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''سچ ہمیشہ کڑوا ہی ہوتا ہے.....اسی لیے تو سچ بولنے کا حوصلہ ہم جیسے لوگ کبھی کبھی ہی کر پاتے ہیں'' مہروز نے کافی کا سپ لیکر مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوہو.....ویسے اگر تم سچ بولنے کا حوصلہ کر ہی بیٹھے ہو تو ایک سچ اور بول لو.....ذرا یہ تو بتاؤ کہ واپس جانے کا فیصلہ تم نے کس کے لیے کیا ہے....انکل آنٹی کے لیے یا پھر.....''

عادل کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑا ''دونوں کے لیے.....میں نے امی ابو کی اپنے اکلوتے بیٹے سے جڑی امیدوں کو توڑا ہے.....شائنزے کے خوابوں کو توڑا ہے اور وہ بھی ان خوابوں کو جو میں نے خود اس کی آنکھوں میں سجائے تھے اور یہ دونوں ہی جرم قابل معافی نہیں لیکن پھر بھی یہ سوچ کر میں ان کے سامنے جا رہا ہوں کہ شاید وہ مجھے معاف کر دیں اور اگر نہ بھی کر پائے تو کم از کم دل کو یہ تسلی تو رہے گی کہ وہ میری نظروں کے سامنے ہیں.....میرے پاس ہیں....'' وہ تھکے تھکے سے انداز میں چلتا ہوا سائیڈ میں رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''تو نے اطلاع دے دی ہے اپنے آنے کی'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد عادل نے پوچھا۔

''نہیں، میں انھیں سرپرائز دینا چاہتا ہوں'' اس نے کہا تو اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆ ☆ ☆

''یہ اتنی خاموشی کیوں ہے...'' گل نے لاؤنج میں داخل ہو کر گھر میں پھیلے سناٹے کو دیکھ کر بڑبڑاتے ہوئے سوچا اور کندھے اچکاتی دائیں طرف بنے چھوٹی مامی کے کمرے کی طرف چل دی۔

''ممانی جان!'' اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر جھانک کر چہکتے ہوئے کہا۔

''ارے گل بیٹا!.....آؤ...آؤ...'' گل کی آواز سن کر انھوں نے سنبھلتے ہوئے کہا اور جلدی سے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھ ڈالے لیکن ان کے لہجے کا بھیگا پن اور آنکھوں کی

سرخی اس سے چھپی نہ رہ سکی۔

''ممانی جان!....آپ رو رہی تھیں.....آپ نے وعدہ کیا تھا نا مجھ سے کہ آپ مہروز بھائی کو یاد کر کے روئیں گی نہیں'' اس نے ان کے پاس بیڈ پر بیٹھ کر ان کا سر اپنے کاندھے پر ٹکا لیا۔

''یہ آنسو تو شاید میری قسمت میں لکھ دیئے گئے ہیں.... پہلے مہروز اور اب.....'' وہ کہتے کہتے رک گئیں تو وہ چونک اٹھی۔

''ممانی جان!.....کچھ ہوا ہے کیا....؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''جو ہوا ہے اسی میں بہتری ہے۔تم شائنزے کو سمجھاؤ۔خود کو ہلکان مت کرے وہ....خوابوں کے سہارے زندگی نہیں کٹتی....ادھورے خواب زندگی کا روگ بن جاتے ہیں اور اگر ٹوٹ جائیں تو ان کی کرچیاں ساری زندگی آنکھوں میں چبھتی رہتی ہیں.....اسے سمجھاؤ،مہروز جو خواب اسے دکھا کر گیا تھا جتنی جلدی وہ ان سے باہر آ جائے،اس کے لیے اچھا ہے.....اسے یوں تڑپتے سسکتے میں نہیں دیکھ سکتی''

وہ بہت نرمی سے اس سے علیحدہ ہوئی تھیں لیکن آنکھوں کے گوشے ایک بار پھر بھیگنے لگے تھے۔وہ چاہ کر بھی انھیں کوئی تسلی نہ دے پائی اور خاموشی سے اٹھ کر ان کے کمرے سے نکل گی لیکن کمرے سے نکلتے ہوئے اس نے ان کی سسکیوں کی بہت دھیمی دھیمی آوازیں بھی بخوبی سن لی تھیں لیکن انھیں نظر انداز کرتی سیدھی اوپر شائنزے کے کمرے میں چلی آئی۔گل اندر داخل ہوئی تو وہ بیڈ پر نیم دراز بنا پلکیں جھپکائے چھت کو گھور رہی تھی۔

''شائنزے!.....'' اسے خیالوں میں گم دیکھ کر اس نے آہستہ سے پکارا۔

''ہوں.....'' اس نے چونک کر اسے دیکھا اور اٹھ کر بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

''کیسی ہو ....؟'' وہ آہستہ روی سے قدم بڑھاتی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''پتا نہیں.....بہت دنوں سے خود کو دیکھا نہیں میں نے ۔تم ہی دیکھ کر بتا دو کہ کیسی ہوں میں....'' اس کی نظریں اب بھی خلاؤں میں بھٹک رہی تھیں۔

''شائنزے! سنبھالو خود کو.....تقدیر سے لڑا نہیں جا سکتا اگر مہروز تمھاری قسمت میں نہیں تو ساری دنیا مل کر بھی اسے تمھارا نہیں بنا سکتی اور اگر وہ تمھارا نصیب ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے تم سے جدا نہیں کر سکتی'' گل نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''میں تھک چکی ہوں گل!.....پچھلے آٹھ سالوں سے تنہا چلتے چلتے میں تھک گئی ہوں....اب میں ٹھہر جانا چاہتی ہوں لیکن زندگی ہے کہ مجھے رکنے کا موقع ہی نہیں دیتی اور مجھ میں مزید چلنے کی سکت نہیں.....کتنی دیر اور کھڑی رہ پاؤں گی، یہ کہنا مشکل ہے.....جی چاہتا ہے کہ ایک لمبی نیند سو جاؤں'' شائنزے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ اس کی آنکھوں میں پھیلی ویرانی دیکھ کر تڑپ اٹھی۔

''ایسے نہیں کہتے.....مایوسی کفر ہے، جانتی ہو نا''

''جاننے اور جینے میں بہت فرق ہوتا ہے.....اب تک تو اس کے لوٹ آنے کی امید کے سہارے جی رہی تھی لیکن کچھ دنوں بعد یہ امید بھی اپنی موت آپ مر جائے گی...'' اس کے بھیگے لہجے اور انداز پر وہ چونک اٹھی۔

''شائنزے!.....کہیں بڑی ممانی نے.....؟'' گل نے ڈرتے ڈرتے اپنے بدترین خدشوں کو زبان دی۔

''ہاں.....آج سے ٹھیک ایک ماہ بعد کی، شادی کی تاریخ رکھی گئی ہے....'' اس نے آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا تو گل فوراً ہی اس کے گلے لگ گئی۔اس کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں اور شائنزے کے آنسو تو گالوں پر لڑھک رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

عادل اسے چھوڑنے ائیر پورٹ آیا تھا۔پیسینجرز کو کال کیا جانے لگا تو اس نے ایک بیگ اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔

''چلتا ہوں.....اپنا خیال رکھنا اور کوشش کرنا کہ تم بھی خواہشوں کی ان بیڑیوں سے جلدی پیچھا چھڑا سکو'' مہروز نے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو اس نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔

''اسلام آباد پہنچتے ہی مجھے فون کرنا مت بھولنا اور ہاں میں نے امی کو تمھارے آنے کی اطلاع دے دی ہے۔علی تمھیں ریسیو کرنے ائیر پورٹ پہنچ جائے گا۔رات تم نے میرے گھر پر ٹھہرنا ہے۔اگلے دن بے شک صبح صبح ہی مظفر آباد کے لیے روانہ ہو جانا لیکن رات کو تم سفر نہیں کرو گے'' اس سے الگ ہوتے ہوئے عادل نے اسے ایک بار پھر یاد کروانا ضروری سمجھا۔

''کل سے کوئی دسویں بار تم مجھے یہ سب بتا رہے ہو'' مہروز نے مسکراتے ہوئے دوسرا بیگ اٹھا لیا۔

''کیوں کہ مجھے معلوم ہے کہ تیری یادداشت بڑی کمزور ہے.....تیرا کیا بھروسا کہ علی تجھے ائیر پورٹ پر ڈھونڈتا رہے اور تو نکل کھڑا ہو''

''بے فکر رہ اتنا تو مجھے یاد ہی رہے گا کہ میں نے تیرا دیا ہوا ایک گفٹ تیرے گھر والوں کو دینا ہے.....'' مہروز نے جان بوجھ کر گفٹس کی تعداد کم بتاتے ہوئے کہا۔

''ایک نہیں دس گفٹس ہیں'' عادل نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''ایک ہو یا دس۔کیا فرق پڑتا ہے۔ویسے بھی زیرو کی تو کوئی ویلیو ہی نہیں ہوتی'' اس نے اسے مزید چڑاتے ہوئے کہا۔

''ابھی بتاتا ہوں کہ ویلیو ہوتی ہے یا نہیں.....'' اس نے مکا بنا کر اس کی طرف اٹھایا تو

وہ ڈرنے کی ایکٹنگ کرتا دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''ارے یار! کیا کرتا ہے، کہیں چہرے پر کوئی ڈنٹ ونٹ پڑ گیا تو شائنزے نے فوراً ہی انکار کر دینا ہے ''

''پھر تو اور بھی اچھا ہے، تو اسی قابل ہے'' اس نے ہاتھ نیچے گرا لیا۔

''میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔ بس میرا نام لینے کی کسر رہ گئی''

لاسٹ کال کا سن کر مہروز نے کہا تو وہ بھی سب کچھ بھول کر ایک بار پھر اس کے گلے لگ گیا۔ پچھلے آٹھ سالوں سے ان دونوں نے اپنا ہر دکھ سکھ ایک دوسرے کے ساتھ بانٹا تھا اسی لیے آج دونوں کے ہی دل اداس ہو رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

اسلام آباد ائیر پورٹ کے پیسنجرز لاؤنج میں کھڑا وہ ادھر ادھر علی کی تلاش میں نظریں دوڑا رہا تھا کہ اچانک ہی اس کی نظر ٹی وی سکرین پر پڑی اور سکرین پر دکھایا جانے والا منظر دیکھ کر وہ چونک اٹھا۔ وہ ٹی وی سے کافی دور کھڑا تھا اس لیے آواز تو اسے سنائی نہیں دے رہی تھی لیکن تباہ حال مکانوں کا منظر اسقدر دل دہلا دینے والا تھا کہ بے اختیار ہی اس کے قدم اس طرف اٹھنے لگے جہاں کافی تعداد میں لوگ ٹی وی کے سامنے جمع تھے۔ ابھی اس نے چند قدم ہی آگے بڑھائے تھے کہ کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے روک دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو پیچھے علی کھڑا تھا۔

''مہروز بھائی! آپ کہاں جا رہے تھے''

''وہ ٹی وی پر.....'' علی نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے اسے بات مکمل ہی نہیں کرنے دی۔

''آپ میرے ساتھ چلیں.....گھر چل کر آرام سے بات کریں گے.....'' علی نے

اس کے ہاتھ سے ایک بیگ پکڑتے ہوئے کہا۔

''لیکن.....'' علی کا رویہ اسے الجھن میں ڈال رہا تھا جیسے وہ اس سے کچھ چھپا رہا ہو۔

''پلیز مہروز بھائی!.....آپ آیئے میرے ساتھ.....'' اس نے دوسرا بیگ بھی پکڑ کر اسے اپنے پیچھے آنے پر مجبور کر دیا لیکن اس کے پیچھے چلتے ہوئے اس نے لوگوں کے چہروں کی طرف بغور دیکھا تو کئی چہروں پر اسے گہرے دکھ کے بادل چھائے نظر آئے۔ پھر اس کے کانوں میں کچھ ادھوری باتیں بھی پڑنے لگیں اور ان سب باتوں میں ایک لفظ مشترک تھا.....زلزلہ۔فلائیٹ کے دوران تو وہ واک مین لگائے آنکھیں موندے سیٹ پر نیم دراز ماضی کے خیالوں میں ہی گم رہا تھا۔لندن سے یہاں تک کے سفر میں وہ اسقدر خوش کن احساسات میں گھرا رہا تھا کہ ٹی وی یا لوگوں کے پریشان حال چہروں پر نہ تو اس کی نظر پڑی تھی اور نہ اس نے دیکھنے کی کوشش ہی کی تھی لیکن یہاں پہنچتے ہی کسی انہونی کے ہونے کا احساس اسے شدت سے ہونے لگا تھا۔

علی نے سامان گاڑی کی بیک سیٹ پر رکھا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔مہروز نے بھی اپنے کندھے سے لٹکا بیگ اتار کر بیک سیٹ پر رکھا اور فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گیا۔اس کے بیٹھتے ہی علی نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔

''علی!.....زلزلہ آیا ہے نا.....ٹی وی پر بالاکوٹ کا علاقہ دکھا رہے تھے، وہاں کی حالت تو بہت بری تھی۔کیا بہت شدید نوعیت کا تھا'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد جب اس سے رہا نہ گیا تو اس نے پوچھ ہی لیا۔

''جی بھائی!.....بہت ہی شدید..... پورے کے پورے علاقے تباہ ہو گئے ہیں'' اس نے زیادہ طویل جواب دینے سے گریز ہی کیا تھا۔

''کون کون سے علاقے لپیٹ میں آئے ہیں'' اس کا یہ گریز اسے اور الجھا رہا تھا۔

''کافی سارے ہیں.....آپ گھر چل کر نیوز دیکھ لیجیے گا نا'' اس نے سڑک پر نظریں جمائے کہا تو وہ ایک گہرا سانس بھر کر رہ گیا۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔گھر کی چابی علی کے پاس تھی۔اس نے گیٹ کھولا اور گاڑی پورچ میں لے جا کر روک دی۔مہروز گاڑی سے سامان اتارنے لگا جبکہ وہ خود گیٹ لاک کرنے چل دیا۔پھر وہ دونوں سامان اٹھائے آگے پیچھے چلتے ہوئے لاؤنج میں داخل ہوئے، جہاں علی کی امی صوفے پر بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔آہٹ پر انھوں نے پلٹ کر دیکھا۔

''ارے مہروز بیٹا!.....آ گئے تم.....'' وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کر اس کی طرف بڑھیں لیکن اس کی نظریں تو ٹی وی سکرین پر جیسے جم سی گئی تھیں۔ٹی وی پر مظفر آباد کا علاقہ دکھایا جا رہا تھا۔ٹوٹے پھوٹے گھر، بین کرتے لوگ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا اور بیگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کے قدموں میں آ گرا۔

''مہروز بھائی!.....'' اس کی حالت دیکھ کر علی نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پکارا تو وہ چونکا۔

''ہوں.....یہ سب.....مجھے ابھی جانا ہے'' وہ ایک دم تڑپ اٹھا۔اس سے پہلے کہ وہ باہر کی طرف بھاگتا علی نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر روک لیا۔

''آپ ابھی نہیں جا سکتے.....اس وقت آپ کو کوئی سواری نہیں ملے گی''

''میں پیدل چلا جاؤں گا'' اس نے اپنے بازوؤں کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن علی کی گرفت کافی مضبوط تھی حالانکہ وہ اس سے تین چار سال چھوٹا تھا لیکن جسمانی طور پر زیادہ مضبوط تھا۔

''مہروز بھائی! پلیز.....سنبھالیے اپنے آپ کو.....سواری تو دور کی بات ہے سڑکیں

تک ٹوٹ پھوٹ چکی ہیں اور اس وقت جانا خودکشی کے مترادف ہوگا....آپ حوصلہ رکھیے، وہ لوگ ٹھیک ہوں گے۔آپ صبح ہی میری گاڑی لیکر نکل جایئے گا'' اس نے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا اور اسے پکڑ کر صوفے پر بٹھادیا۔

''فون.....میں فون کرتا ہوں...'' وہ ایکدم اٹھ کھڑا ہوا۔اسے کسی طور قرار نہیں آرہا تھا۔

''کوئی فائدہ نہیں۔تمام لائنیں بے کار ہوچکی ہیں، یہاں تک کہ موبائل نیٹ ورک بھی کام نہیں کررہا'' اس نے اسے دوبارہ پکڑ کر بٹھایا تو اس نے تھکے تھکے سے انداز میں سر صوفے کی بیک سے ٹکادیا۔

''حوصلہ رکھو بیٹا!.....وہ لوگ ٹھیک ہوں گے'' وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئیں اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

''اگر انھیں کچھ ہوگیا نا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کرپاؤں گا'' وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوگیا۔

''تم پریشان مت ہو۔دیکھنا.....'' ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''پلیز آنٹی!.....میں کچھ دیر کے لیے اکیلا رہنا چاہتا ہوں.....'' اس نے بوجھل سے انداز میں کہا۔

''آیئے مہروز بھائی! میں آپ کو آپ کا کمرا دکھادیتا ہوں، کچھ دیر ریسٹ کریں گے تو طبیعت سنبھل جائے گی'' وہ سامان اٹھا کر چل پڑا تو مہروز بھی شکستہ قدموں سے اس کے پیچھے چل پڑا۔

علی اس کا سامان کمرے میں رکھ کر چلا گیا تو اس نے کمرا اندر سے لاک کیا اور خود کو بیڈ

پر گرالیا لیکن دل اسقدر بوجھل ہو رہا تھا کہ وہ دوبارہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔اچانک ایک خیال کے تحت اس نے اپنا موبائل نکالا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔تین چار بار ٹرائی کرنے کے باوجود جب نمبر نہیں ملا تو اس نے غصے میں موبائل کو دیوار پر دے مارا۔

''پتا نہیں کیا حال ہوگا ان لوگوں کا.....جب انھیں میری سب سے زیادہ ضرورت ہے تو میں ان کے پاس نہیں.....ان کے ساتھ نہیں'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر سر جھکا لیا۔

☆ ☆ ☆

کئی گھنٹے کی لگاتار ڈرائیو کے بعد آخر وہ مظفر آباد کی حدود میں داخل ہو گیا تھا۔یہاں تک آتے آتے اس نے تباہی و بربادی کا جو حال دیکھا تھا اس نے اس کی دھڑکنیں ویسے ہی بے ترتیب کر رکھی تھیں لیکن اپنے شہر کا حال دیکھ کر تو اس کے حواس ہی جواب دیتے جا رہے تھے،کئی گھنٹے اس نے ڈرائیو کر لی تھی لیکن اب کچھ منٹوں کی ڈرائیو کرنا اس کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔جیسے تیسے کر کے وہ اپنے گھر کے نزدیک پہنچ گیا لیکن آگے جانے کا بالکل راستہ نہیں تھا۔اس نے گاڑی ایک طرف روک کر لاک کی اور پیدل ہی چل پڑا۔

ہر طرف ایک سا ہی منظر تھا۔گھروں کے ملبے تلے دبی لاشیں.....اپنے پیاروں کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑتے لوگ.....بچوں کو ڈھونڈتی ماؤں کی متلاشی نگاہیں.....مردہ جسموں کے پاس بیٹھے سوالیہ آنکھوں سے تکتے معصوم بچے.....یہ سب کچھ اتنا دل دہلا دینے والا تھا کہ وہ پاگلوں کی طرح دوڑتے ہوئے اپنے گھر کے سامنے جا رکا.....گھر.....جس کا اب کوئی نام و نشان نہ تھا وہاں تو بس ہر طرف اینٹ پتھر ہی نظر آ رہے تھے۔یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ایک ہولناک طوفان تھا جو آ کر گزر گیا تھا اور اپنے پیچھے چھوڑ گیا تھا صرف نشانی.....تباہی کی.....بربادی کی.....

''امی!.....بابا!.....شائنزے!.....'' وہ بے قرار ہو کر چلا چلا کر پکارنے لگا۔

''مہروز بیٹا!....'' ایک بھرائی ہوئی آواز سنائی دی تو اس نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا۔

''چاچو!....'' وہ دوڑ کر ان کے گلے لگ گیا۔

''تم نے بہت دیر کر دی بیٹا!.....بہت دیر.....دیکھو یہاں کیا ہو گیا.....سب ختم ہو گیا.....سب.....'' اسے سامنے دیکھ کر ان کے آنسو بھی بہ نکلے۔

''چاچو! یہ سب کیسے ہو گیا.....امی.....بابا.....'' اس نے ان کے گلے لگے لگے کہا۔اس کی آنکھوں کے گوشے بھی بھیگنے لگے تھے لیکن اس نے انھیں ہتھیلی کی پشت سے پونچھ ڈالا۔

''کوئی نہیں بچا بیٹا!.....کوئی نہیں.....آؤ میرے ساتھ''

انھوں نے اس سے الگ ہو کر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے چل پڑے۔اس نے ایک الوداعی نظر اس گھر کے ملبے پر ڈالی جہاں اس کا بچپن گزرا تھا، جس سے اس کی کئی خوبصورت یادیں وابستہ تھیں لیکن اب وہ محض ایک ویران کھنڈر نظر آ رہا تھا۔وہ شکستہ قدموں سے ان کے پیچھے چل پڑا۔کچھ دور چلنے کے بعد وہ رکے تو وہ بھی رک گیا۔

''آؤ آخری بار دیکھ لو انھیں.....'' انھوں نے درد بھرے لہجے میں اس کے سامنے سے ہٹتے ہوئے کہا۔سامنے کچھ لاشیں پڑی ہوئی تھیں جن پر چادریں ڈالی گئی تھیں۔وہ کانپتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھا اور زمین پر بیٹھ گیا۔اس نے ایک نظر چاچو کی طرف دیکھا جو نڈھال سے سر جھکائے کھڑے تھے اور پھر ہمت کر کے چادر کا کونہ پکڑ کر چہرے سے ہٹا دیا۔

''امی.....'' ماں کو دیکھ کر وہ خود پر سے اختیار کھو بیٹھا اور سسک اٹھا۔اس نے بڑی

ہی نرمی سے ان کے ماتھے پر بوسہ دیا اور پھر کتنی ہی دیر ان کا ہاتھ اپنے چہرے سے لگائے رہا۔آخر انھوں نے آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے اپنا چہرہ اٹھایا جو آنسوؤں سے تر تھا۔

''میں بہت برا ہوں نا چاچو!.....بہت برا.....بہت دل دکھایا ہے نا میں نے امی بابا کا.....برسوں ان کی خبر نہیں لی اور دیکھیں اب جب لوٹا ہوں تو یہ مجھ سے روٹھ گئے ہیں''

اس نے ان کا ہاتھ نرمی سے زمین پر واپس رکھا اور چہرہ دوبارہ چادر سے ڈھانپ دیا۔پھر اس نے بابا کے چہرے سے چادر ہٹا کر ان کی ٹھنڈی پیشانی پر ہونٹ ثبت کر دیئے۔امی بابا کو دیکھ لینے کے بعد شائنزے کا چہرہ دیکھنے کی تو اس کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی آخر بڑی مشکل سے تمام ہمتیں مجتمع کر کے اس نے شائنزے کے چہرے سے بھی چادر ہٹا دی۔جن آنکھوں میں اس نے ہمیشہ اپنا چہرہ دیکھا تھا آج وہ آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھیں۔

''بہت دیر کر دی نا میں نے لوٹنے میں.....بہت دیر.....میں تو تم سب کو سرپرائز دینا چاہتا تھا لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ اس سے پہلے ہی تقدیر اپنا وار کر جائے گی.....شاید یہی میری سزا ہے کہ جو درد میں نے تم سب کو دیا اب اسی درد کو زندگی بنا کر مجھے جینا ہو گا.....لیکن سزا تو صرف مجھے ملنی چاہیے تھی نا....تم لوگوں پر زندگی کیوں تنگ کر دی گئی.....تم سے جینے کا حق کیوں چھین لیا گیا.....کیوں.....؟''

''کچھ سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہوتا بیٹا!.....کوئی جواب نہیں.....'' چاچو نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔

☆ ☆ ☆

اکتوبر آٹھ

وہ گلنار کے ساتھ سوکھی لکڑیاں اکٹھی کر رہی تھی کہ اچانک گلنار نے پوچھا ''تیرا بابا کیسا ہے اب؟..... ابا بتا رہا تھا کہ حکیم نے بھی جواب دے دیا ہے''

گلنار کے سوال پر سوکھی لکڑیوں کی طرف بڑھا نوری کا ہاتھ ایک پل کے لیے تھم سا گیا۔

''ہاں بس آخری سانسیں گن رہا ہے اپنی..... پتا نہیں کیسا نصیب ہے میرا ابھی، ایک مصیبت ختم ہوتی نہیں کہ دوسری آجاتی ہے'' اس نے ایک گہرا سانس بھر کر کہا اور دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔

''تو فکر نہ کر، اللہ سائیں سب ٹھیک کر دے گا'' گلنار نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ وہ اس کے حالات سے اچھی طرح واقف تھی۔

''ہا..... کیا ٹھیک کرے گا..... جانے کیا ہونے والا ہے۔ میرا دل تو بہت ڈرتا ہے۔ ایک وہ دلاور خان ہے جو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا ہے اوپر سے ہاشم بھی اب

تک شہر سے نہیں لوٹا اور بابا کی جو حالت ہے..... کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں..... کہاں جاؤں'' اس کے چہرے پر فکرمندی کی بہت گہری چھاپ تھی۔

''میں تو کہتی ہوں کہ ہاشم واپس آ جائے تو اسے کہہ کر فوراً بیاہ کر لے تو..... دلاور خان کی نیت تو صاف ظاہر ہے۔اس سے پہلے کہ کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو ہاشم سے بات کر..... کیونکہ دلاور خان کے خلاف تو شکایت بھی نہیں کی جا سکتی۔ وہ تو اس علاقے کا مالک ہے اور ہماری زندگیوں پر بھی اپنا ہی حق سمجھتا ہے'' اس کے لہجے میں دلاور خان کے لیے نفرت صاف ظاہر تھی۔

''کہتی تو تو ٹھیک ہی ہے پر ہاشم کے حالات بھی تو ہم سے چھپے نہیں۔ چاچا بیچارا تو ویسے ہی ٹانگوں سے معذور ہے۔اور پھر چاچی ،صنوبر اور امینہ ہیں اور وہ اکیلا کمانے والا۔ جب کہ دلاور خان نے اسے اپنے کارخانے سے بھی نکال دیا ہے۔اب وہ گیا تو ہے شہر نوکری کی تلاش میں..... دیکھو کیا ہوتا ہے''

فکروں اور پریشانیوں نے اس کے چہرے کی معصومیت پر سنجیدگی کی تہ چڑھا دی تھی۔حالانکہ اس کی عمر ابھی بمشکل انیس بیس سال تھی لیکن ماں کی اچانک موت ،بابا کی بیماری اور اس کے اکیلے پن نے اسے اتنی کم عمری ہی میں سنجیدہ بنا دیا تھا۔اپنی عمر کی دوسری لڑکیوں کی طرح شوخی اور چنچل پن تو اس سے کہیں بہت پیچھے چھوٹ گیا تھا۔اب تو ہر وقت اس کے چہرے پر سوچ کی گہری لکیریں دکھائی دیتی تھیں۔آنے والے کل اور اپنے مستقبل سے وہ خاصی خوفزدہ تھی۔ ہاشم کے متعلق سوچتے ہوئے خیال کی رو اسے بہت دور لے گئی تھی کہ اچانک دور سے آتی جیپ کی آواز سن کر وہ چونک اٹھی۔

''دلاور خان....'' بے ساختہ ہی اس کے لبوں سے نکلا اور اس نے پریشان ہو کر گلنار کی طرف دیکھا تو وہ بھی اسے کچھ گھبرائی ہوئی سی لگی۔

''لگتی تو اسی کی جیپ ہے.... تو جلدی سے گٹھا باندھ.....'' گلنار نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے اسے تسلی دی اور پھر جلدی جلدی دونوں نے اپنی جمع کی ہوئی سوکھی لکڑیوں کو باندھا اور اپنے سر پر رکھ کر چل پڑیں۔ابھی وہ چند قدم ہی آگے گئی تھیں کہ تیز رفتاری سے ان کے پیچھے آتی جیپ، سائیڈ سے آگے نکل کر بالکل ان کے سامنے آ کر رک گئی۔راستہ بند ہو جانے کی وجہ سے ان دونوں کو رکنا پڑا۔

دلاور خان خباثت سے مسکراتے ہوئے جیپ سے اترا۔راستہ روکے جانے پر غصہ تو ان دونوں کو بہت آیا تھا لیکن دلاور خان کو جیپ سے اترتے دیکھ کر دونوں نے چپ رہنے میں ہی عافیت جانی۔وہ کروفر سے چلتا ان کے قریب آ گیا۔

''کدھر جا رہے ہو بادشاہو!....کبھی ہماری طرف بھی پیار سے دیکھ لیا کرو'' دلاور خان کی ہوس بھری نظریں نوری پر جیسے چپک سی گئی تھیں۔نوری اس علاقے کی نہایت خوبصورت لڑکی تھی۔جس دن سے لاور خان کی نظر اُس پر پڑ گئی۔۔۔۔ تب سے دلاور خان کی ہر ممکن کوشش تھی کہ وہ نوری کو کسی بھی طرح حاصل کر لے۔

''راستہ چھوڑو خان!'' نوری نے خود کو مضبوط ظاہر کرنے کے لیے کسی قدر سخت لہجے میں کہا ورنہ اس کی نظروں نے تو اسے اندر تک ہلا کر رکھ دیا تھا۔

''ارے ایسے کیسے چھوڑ دوں ...اب بھی کہتا ہوں شرافت سے مان جا اور اس ہاشم کا خیال اپنے دل سے نکال دے ورنہ تیرے جیسے پھول کو مسلنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی''

اس نے آگے بڑھ کر کوئی گستاخی کرنی چاہی لیکن گلنار اس کے خطرناک ارادے دیکھ کر فوراً بول پڑی ''چل نوری!....ابا آ رہا ہے''

گلنار نے اس انداز سے کہا کہ دلاور خان بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور موقع پا کر وہ دونوں تیزی سے وہاں سے نکل گئیں۔

''بھاگ لے .... میں بھی دیکھتا ہوں تو کب تک بھاگتی ہے.....'' دلاور خان کی کینہ توز ہنسی نے بہت دور تک ان کا پیچھا کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

شام آہستہ آہستہ گہری ہو رہی تھی۔سورج آسمان کی بلندیوں کو چھوتا اب مغرب کے دامن میں جا رہا تھا۔اندھیرا روشنی کا تعاقب کرتے کرتے آخر اس پر حاوی ہونے کے قریب تھا۔دن کے ہنگامے خاموشی کی چادر اوڑھے سونے کی تیاری میں مصروف تھے۔زندگی کا ایک اور تھکا دینے والا دن اختتام پزیر ہو رہا تھا لیکن ندی کے کنارے بہتے پانی پر نظریں جمائے بیٹھی نوری کی سوچیں ہر ختم ہونے والے دن کے ساتھ بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ہاشم آج دوپہر ہی شہر سے لوٹا تھا اور اس وقت اس کے ساتھ موجود تھا لیکن وہ چاہ کر بھی اس کا ساتھ محسوس نہیں کر پا رہی تھی۔ایسے لگتا تھا کہ وہ بالکل اکیلی ہے۔آنے والے کل کے اندیشے اسے کچھ اور سوچنے ہی نہیں دے رہے تھے۔ہاشم اتنی دیر سے اسے کیا بتا رہا تھا،اسے کچھ خبر نہیں تھی۔وہ تو اپنے ہی خیالوں میں گم تھی۔

''کیا بات ہے..... میری نوکری لگنے پر تجھے خوشی نہیں ہوئی.....؟'' اسے یوں گم صم سا دیکھ کر وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

''ہاشم!..... تو کل ہی واپس چلا جائے گا؟''نوری نے اس کے سوال کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔

''جانا تو پڑے گا۔نئی نئی نوکری ہے، یہ ایک دن کی چھٹی بھی بڑی مشکل سے ملی ہے.....لیکن تو فکر نہ کر کچھ دنوں بعد میں دو تین دن کی چھٹی لے کر آؤں گا۔میں نے اماں کو کہہ دیا ہے کہ وہ شادی کی تیاری رکھے'' وہ اس کے ڈر جانتا تھا اس لیے اسے تسلیاں دینے لگا۔

''اور اگر تب تک بہت دیر ہو گئی تو.....'' اس نے متوحش سے لہجے میں پوچھا تو اس

کے انداز پر وہ چونک اٹھا۔ وہ کتنی ہی دیر سے یوں بت کی مانند پانی پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ ہاشم نے اسے کندھوں سے تھام کر ایک جھٹکے سے اپنی طرف گھما ڈالا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔

''نوری!.....کیا ہو گیا ہے تجھے ..... کیسی دیر.....؟'' ہاشم نے اسے جھنجھورتے ہوئے کہا تو وہ اس ٹرانس سے باہر آ گئی جس نے ہاشم کے دوبارہ چلے جانے کا سن کر اچانک ہی اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

''مجھے بہت ڈر لگتا ہے ہاشم!..... پتا نہیں کیا ہونے والا ہے.... '' ٹرانس سے باہر آتے ہی اب وہ خوف آنسوؤں کی شکل میں آنکھوں سے باہر آ رہا تھا۔

''تو بھی بالکل جھلّی ہے ..... کچھ نہیں ہو گا .....بس کچھ دنوں کی تو بات ہے..... '' اس نے آہستہ سے اس کے سر پر ہاتھ مارا۔

''کچھ دن..... جانے کب ختم ہوں گے یہ کچھ دن'' اس نے یاسیت سے کہہ کر اپنی چادر کے پلو سے آنسو پونچھ ڈالے۔

''کہیں تو دلاور خان کی وجہ سے تو پریشان نہیں.....ہاں.....اس نے پھر کوئی حرکت کی ہے کیا'' اس کا خوف دیکھ کر اچانک ہی اسے خیال آیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا بس سر جھکائے دوپٹے کے پلو سے کھیلتی رہی مگر اس کی خاموشی نے اسے سب کچھ سمجھا دیا۔

''دلاور خان کو اب اس کی حدیں بتانی ہی پڑیں گی'' اس کا گریز دیکھ کر وہ طیش میں آ کر اٹھنے ہی والا تھا کہ نوری نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''نہ ہاشم!.... دلاور خان سے دشمنی کا مطلب موت ہے اور میں تجھے کھونا نہیں چاہتی'' اس نے منت بھرے انداز میں کہا تو اس نے اٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا لیکن اس کے سختی سے بھنچے ہوئے لب بتا رہے تھے کہ وہ اپنے غصے کو کتنی مشکل سے قابو کیے ہوئے ہے۔ ''دلاور

خان کے خلاف اُٹھا تیرا ایک بھی قدم صرف میرے لیے ہی نہیں بلکہ تیرے لیے بھی مشکلیں کھڑی کرسکتا ہے..... تو اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ وہ کچھ بھی کر گزرنے کی طاقت رکھتا ہے'' نوری اسے کیا سمجھانا چاہتی تھی وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔

''ٹھیک ہے.... میں کچھ بھی کر کے اگلے ہی ہفتے دو دن کی چھٹی لے کر آجاؤں گا..... ایک بار شادی ہو جائے پھر میں وہیں کوئی چھوٹا موٹا گھر دیکھ لوں گا تا کہ اس دلاور خان نامی مصیبت سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل جائے''

''ہاں یہی ٹھیک رہے گا'' نوری نے بھی اس کی تائید کی اور پھر وہ دونوں اپنے اپنے ڈر اور نفرتوں کے سائے میں گھرے بہت دیر وہیں بیٹھے رہے۔

☆ ☆ ☆

وہ گلنار کے ساتھ ہاشم کو لاری اڈے تک چھوڑنے آئی تھی۔ ہاشم اسے تسلیاں دیتا اور بہت سے وعدے کرتا بس میں سوار ہو گیا۔ وہ اس وقت تک وہیں کھڑی بس کو جاتا دیکھتی رہی جب تک کہ بس اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

''چلیں نوری!.....'' گلنار نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ چونک اٹھی۔

''ہوں.....ہاں.....'' اس نے سامنے اڑتی دھول میں ہاشم کا چہرہ تلاش کرنا چاہا لیکن بس تو کب کی جا چکی تھی۔ اس نے تھکے سے انداز میں سر جھکایا اور واپس جانے والے راستے پر مڑ گئی۔ اسے یوں بے دلی سے چلتا دیکھ کر گلنار بھی اس کے ساتھ چلنے لگی۔

''کیا بات ہے نوری!.... ہاشم نے کب واپس آنے کو کہا ہے.....؟'' گلنار نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

''کہہ تو رہا تھا کہ جلد ہی آئے گا'' اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ایک گہرا

سانس بھر کر کہا۔

''تو پھر تو اتنی پریشان کیوں ہے.... تجھے کیا لگتا ہے کہ وہ جلدی نہیں آپائے گا کیا'' اس نے بغور اس کے چہرے پر نظریں جمائے پوچھا۔

''پتا نہیں. مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا..... جانے یہ کیسے خوف ہیں جنھیں کہتے ہوئے بھی میں ڈرتی ہوں ..... ''اس کی پیشانی پر سوچ کی بہت گہری لکیریں تھیں۔

''تو بھی نا خوامخواہ ڈرتی رہتی ہے ..... دیکھنا ہاشم کے آنے کے بعد سب ٹھیک ہوجائے گا اور تیرے یہ سارے ڈر بے بنیاد ثابت ہوں گے، انشاللہ'' گلنار نے اس کے اوہام کو نظر انداز کرنا چاہا۔

''کاش ایسا ہی ہو..... '' بے ساختہ اس کے لبوں سے دعائیہ انداز میں نکلا۔

''ایسا ہی ہوگا'' گلنار نے یقین سے پُر لہجے میں کہتے ہوئے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تو اس کے لبوں پر بھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

☆ ☆ ☆

گلنار کی اماں بیمار تھیں، اس لیے آج وہ اس کے ساتھ جنگل سے لکڑیاں اکٹھی کرنے نہیں جا رہی تھی۔ نوری اکیلے جنگل کی طرف جانا نہیں چاہتی تھی لیکن لکڑیاں بالکل ختم ہوچکی تھیں۔ کل بابا کی طبیعت بہت خراب تھی، اس لیے وہ گلنار کے ساتھ نہیں جا سکی تھی بلکہ بچی کھچی لکڑیوں پر ہی اس نے کھانا پکالیا تھا۔ لیکن آج آگ جلانے کے لیے لکڑی کا ایک تنکا بھی نہیں تھا، اس لیے ناچار اسے اکیلے ہی جنگل کی طرف جانا پڑا۔ ویسے بھی دن کا وقت تھا اور جنگل میں کام کرنے والے مزدور بھی وہاں چلتے پھرتے نظر آتے رہتے تھے اس لیے وہ خود کو حوصلہ دیتی چلی آئی لیکن اس نے جنگل میں زیادہ اندر تک جانے سے گریز ہی کیا تھا کیوں کہ وہاں دلاور خان سے آمنا سامنا ہوجانے کے امکانات زیادہ تھے۔ وہ روزانہ ہی

معائنہ کرنے وہاں آتا تھا کیونکہ یہ جنگل بھی اسی کی ملکیت تھا اور یہاں موجود لکڑی کا کارخانہ بھی اسی کا تھا جہاں درختوں سے لکڑی کاٹ کر شہر بھیجی جاتی تھی گو کہ اس سارے کام کی نگرانی کے لیے اس نے ایک منشی اور اپنے کچھ بندے رکھے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود وہ یہاں دن میں دو تین بار چکر ضرور لگاتا تھا۔

اس نے سڑک سے اتر کر جنگل کی طرف جاتے ہوئے بڑے ہی محتاط انداز میں پہلے کسی جیپ کی آواز سننے کی کوشش کی لیکن جب کسی بھی قسم کے انجن کا شور بہت دھیان دینے پر بھی اسے سنائی نہ دیا تو اس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے آس پاس موجود سوکھی لکڑیاں اکٹھی کرنی شروع کر دیں۔ جلدی جلدی لکڑیاں اکٹھی کر کے اس نے انھیں باندھا اور سر پر رکھ کر جنگل سے نکل کر سڑک پر آ گئی۔ سڑک پر واپس آ کر اس نے اطمینان کا ایک طویل سانس لیا تھا لیکن اس کا سارا اطمینان سامنے سے آتی دلاور خان کی جیپ کو دیکھ کر ایک دم ہی رخصت ہو گیا اور وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ پائی۔ اس نے بڑی ہی بے چینی سے اپنے آس پاس نظریں دوڑائیں لیکن سڑک اس وقت بالکل خالی تھی اور سڑک کے دونوں طرف موجود جنگل میں بھی اس وقت کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ خوف اچانک اس پر مسلط ہو گیا۔ دلاور خان نے جیپ بالکل اس کے پاس لا کر روک دی۔ اسے اکیلے دیکھ کر دلاور خان کی آنکھوں سے ٹپکتی ہوس میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا اور وہ اس کی نظریں دیکھ کر کانپ اٹھی لیکن اس نے اپنے چہرے پر اس خوف کو آنے نہیں دیا بلکہ اپنے لبوں کو سختی سے بھینچ کر چہرے پر ایک تناؤ کی کیفیت لے آئی۔

''آج تو پھول کانٹے کے بغیر ہی ہے'' دلاور خان نے جیپ سے اتر کر اس کے بالکل قریب آ کر رکتے ہوئے بڑی ہی دلیری سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور اس کے چہرے پر خوف کے سائے لہرانے لگے۔ خود کو مضبوط ظاہر

کرنے کی اس کی ساری کوششیں دلاور خان کی ایک ہی نظر نے بے کار کر دی تھیں۔اسے یوں خوفزدہ ہوتا دیکھ کر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔دلاور خان کو یوں خباثت سے ہنستے دیکھ کر نوری نے سائیڈ سے ہو کر نکلنا چاہا تو دلاور خان نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی اتنی جرأت پر نوری کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔سر پر رکھے لکڑیوں کے گٹھے کو سہارا دیئے اس کا دوسرا ہاتھ جیسے ہی ڈھیلے سے انداز میں نیچے گرا،سر پر رکھا لکڑیوں کا گٹھا بھی نیچے گر گیا۔

''ہاتھ چھوڑ دے خان!.....'' نوری کا لہجہ خوفزدہ ضرور تھا لیکن اس نے دلاور خان کی مضبوط گرفت سے اپنی کلائی چھڑانے کے لیے پورا زور لگا دیا۔

''ارے ایسے کیسے چھوڑ دوں.....اتنی مشکل سے تو ہاتھ آئی ہے آج تو.....''

اس نے نوری کے ہاتھ کو ایک زور دار جھٹکا دے کر اسے اپنی طرف کھینچا۔جھٹکا اتنا شدید تھا کہ وہ لڑکھڑا کر اس کی طرف کھنچتی چلی گئی لیکن اس نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ کر خود کو اس کے سینے سے لگنے سے بچا لیا تھا۔دلاور خان کی اس حرکت نے جہاں اسے بے انتہا خوفزدہ کیا تھا وہاں نفرت اور غصے کی چنگاریاں بھی اس کے اندر بھڑک اٹھی تھیں۔اسی طیش کے عالم میں اس کا ہاتھ اُٹھا اور فضا دلاور خان کے گال پر پڑنے والے طمانچے سے گونج اٹھی۔نوری کی اتنی جرأت پر،بے یقینی کی کیفیت میں گھرے خان کی،ایک پل کے لیے نوری کی کلائی پر گرفت کمزور پڑی تھی۔اسی پل کا فائدہ اٹھا کر نوری نے اپنی تمام ہمتیں مجتمع کر کے اپنی کلائی اس کی گرفت سے آزاد کروائی اور وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔نوری کو یوں بھاگتا دیکھ کر اس نے بھی اس کے پیچھے جانا چاہا لیکن سامنے سے کچھ لوگوں کو آتا دیکھ کر ارادہ ملتوی کر دیا۔

''یہ تھپڑ تجھے بہت مہنگا پڑے گا نوری!.....بہت مہنگا.....'' اس نے غصے سے پھنکارتے لہجے میں کہا اور جیپ میں بیٹھ کر آگے بڑھ گیا۔جبکہ اس کی دھمکی سن کر نوری کی روح

تک کانپ اٹھی تھی لیکن وہ رکی نہیں اور نہ اس نے پیچھے مڑ کر ہی دیکھا بلکہ اسی طرح بھاگتی رہی۔اسے یوں اندھادھند بھاگتے دیکھ کر ان لوگوں میں سے ایک دو نے اسے آوازیں بھی دی تھیں لیکن وہ سب آوازوں کو ان سنی کرتی بہت تیز دوڑتے ہوئے اپنے گھر کی طرف بھاگی۔گھر کے اندر داخل ہو کر اس نے دروازے پر کنڈی چڑھائی اور پھر دروازے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔دلاور خان کی گرفت اب بھی اسے ایک انگارے کی طرح اپنی کلائی پر محسوس ہو رہی تھی۔اب تک وہ بڑی مشکل سے خود کو سمیٹے ہوئے تھی لیکن گھر آ کر وہ ایک دم ہی بکھر گئی۔اپنی بے بسی پر آنسو تیزی سے اس کے گالوں پر لڑھک آئے تھے۔سامنے ہی چارپائی پر بابا نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا۔ستم تو یہ تھا کہ اس کی بے بسی کی داستان سننے والا بھی کوئی نہیں تھا۔وہ گھٹنوں پر سر رکھے چپ چاپ آنسو بہاتی رہی۔

☆ ☆ ☆

ساری رات وہ ان دیکھے اندیشوں کے بارے میں سوچتی رہی، ایک منٹ کیلئے بھی سو نہ پائی اور جب سحری بنانے کیلئے بستر سے اُٹھی تو بابا کی سانس بہت اکھڑ اکھڑ کر آ رہی تھی۔حالانکہ ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا لیکن وہ پھر بھی گھبرا گئی۔بابا کا بستر پر پڑا یہ بے جان سا وجود بھی اس کے لیے بہت بڑا سہارا تھا اور اگر یہ سہارا نہ رہتا.....اس سے آگے سوچیں بھی اس کا ساتھ چھوڑ جاتی تھیں۔اس نے جلدی سے حکیم صاحب کی دی ہوئی دوا بابا کو پلائی پھر ان کے سرہانے ہی فرش پر چارپائی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اور آہستہ آہستہ ان کا سینہ سہلانے لگی۔کتنی ہی دیر وہ یوں ہی بیٹھی دعائیں مانگتی رہی اور پھر کب نیند اس پر حاوی ہوئی اسے پتا ہی نہیں لگا۔

آنکھ کھلی تو احساس ہوا کہ وہ اسی حالت میں بیٹھے سو گئی تھی۔جسم کا زیادہ تر وزن ٹانگوں اور ہاتھوں پر آیا ہوا تھا اس لیے اب ہاتھوں اور ٹانگوں میں ہلکے درد کا احساس ہو رہا تھا۔وہ

ہاتھ پاؤں سیدھی کرتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بابا کی طرف دیکھا تو ان کی حالت میں اب بھی کوئی بہتری کے آثار نہیں تھے۔اس نے دوا کی دوسری خوراک بھی ان کو کھلا دی۔ باہر دن کی روشنی پوری طرح سے پھیل چکی تھی۔نو یا دس بجے کا وقت ہوگا لیکن اس کے لیے تو وقت بابا کی سانسوں کی طرح رک رک کر گزر رہا تھا۔ وہ باہر جانے کی بجائے اپنی چارپائی پر آ کر بیٹھ گئی لیکن اس کی نظریں بابا پر ہی ٹکی تھیں۔ بابا کے چہرے پر موجود کرب کے آثار بتا رہے تھے کہ انھیں سانس لینے میں کتنی مشکل پیش آ رہی ہے۔ بابا کا درد اسے بھی تڑپا رہا تھا لیکن دوا تو وہ دے چکی تھی اور اب سوائے انتظار کے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

صبح سے دوپہر تک وہ گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ایک طرف بابا کی بگڑتی حالت اسے انجانے وسوسوں کا شکار کر رہی تھی تو دوسری طرف دلاور خان کی پرسوں کی حرکت نے اس کے قدموں میں زنجیر ڈال دی تھی اور پھر اس کے خاص بندوں کی اپنے گھر کے آس پاس موجودگی نے اسے اور بھی ڈرا دیا تھا۔گلنار کو اس نے دلاور خان کی حرکت کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔اسی لیے وہ بھی آج اسے اپنے ساتھ لے جانے نہیں آئی تھی کیوں کہ اس کے مطابق نوری کا گھر سے نہ نکلنا ہی ٹھیک تھا۔تھوڑی بہت لکڑی وہ اسے کل رات ہی پہنچا گئی تھی لیکن سحری کے وقت ان کے استعمال کی نوبت ہی نہیں آئی تھی کہ بابا کی حالت نے اسے کچھ کھانے پینے کا ہوش ہی کہاں رہنے دیا تھا۔

بابا کی حالت تیزی سے بگڑ رہی تھی اور اب اس کے پاس گھر سے نکلنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔اس نے خود کو کالی چادر میں اچھی طرح لپیٹا اور گھر سے نکل کر تیز تیز قدم اُٹھاتی گلنار کے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔خدا کا شکر کہ راستے میں دلاور خان کے آدمیوں سے اس کا سامنا نہیں ہوا اور گلنار اور اس کا ابا بھی اسے گھر پر ہی مل گئے۔ وہ ان دونوں کو ساتھ لے کر گھر آ گئی۔گلنار کے ابا نے دو تین لوگوں کو اکٹھا کیا اور پھر وہ سب مل کر بابا کو

اُٹھا کر حکیم صاحب کے پاس لے گئے ۔گلنار اس کے اکیلے پن کے خیال سے اس کے پاس ہی رک گئی۔

مغرب کی اذان ہونے کے قریب تھی اور وہ لوگ اب تک نہیں لوٹے تھے ۔نوری پریشانی کے عالم میں کمرے میں ٹہل رہی تھی ۔اس کا اضطراب اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا جبکہ گلنار چارپائی پر بیٹھی اسے تسلیاں دے رہی تھی۔

''نوری!..... کیوں خود کو ہلکان کر رہی ہے۔آجائیں گے وہ لوگ اور تیرا بابا بھی ٹھیک ہی ہوگا''

''پتا نہیں کیوں ..... لیکن میرے دل کو قرار نہیں آ رہا'' اس کے لہجے میں لرزش نمایاں تھی۔

''ہا.....اچھا تو میں گھر سے ہو کر آتی ہوں ۔اذان ہونے والی ہے کچھ کھانے کو لے آتی ہوں.....'' گلنار اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''مجھے کچھ نہیں کھانا..... بھوک نہیں مجھے.....''اس نے صاف انکار کر دیا۔

''ارے ایسے کیسے بھوک نہیں ..... مجھے پتا ہے تو نے سحری میں بھی کچھ نہیں کھایا ہو گا..... میں ابھی لے کر آتی ہوں تجھے کھانا ہی پڑے گا''اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا لیکن نوری نے کوئی جواب نہیں دیا وہ اپنی ہی سوچوں میں الجھی ٹہلے جا رہی تھی۔

''کنڈی لگا لے .....میں آتی ہوں ابھی .....'' گلنار نے دروازے پر رک کر ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر چوکھٹ پار کر گئی۔

نوری نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کیا اور ابھی وہ کنڈی چڑھانے ہی والی تھی کہ دروازہ پوری قوت سے اسے آ کر لگا جیسے کسی نے لات مار کر دروازہ کھولا ہو اور وہ لڑکھڑا کر دو قدم

پیچھے ہٹ گئی۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتی، کھلے دروازے سے داخل ہوتے دوسایوں نے اس پر ایک چادر ڈال دی۔اس نے تیزی سے چادر چہرے سے ہٹا کر جیسے ہی چیخنے کیلئے منہ کھولا ان دوآدمیوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور اس کی آواز حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔نوری نے اپنے آپ کو اس نقاب پوش سے چھڑانے کے لیے ہاتھ پیر چلانے چاہے تو ان دونوں نے مل کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور پھر اسے چادر میں لپیٹ کر ایک نے اپنے کندھے پر لاد لیا۔

دوسرے نے دروازے پر جا کر پہلے باہر چاروں طرف نگاہ دوڑائی لیکن باہر مکمل خاموشی چھائی دیکھ کر اس نے اشارہ کیا اور پھر وہ دونوں جس طرح خاموشی سے آئے تھے اسی طرح اسے لے کر چلے گئے۔خاموش اور اداس شام بے بس نوری کی خاموش چیخیں تو سن پائی لیکن اس کے لیے کچھ نہ کر سکی۔

☆ ☆ ☆

اچانک ہی اس کا جسم فرش سے ٹکرایا تھا اور وہ کراہ کر رہ گئی۔شاید اسے کسی کمرے کے فرش پر پھینکا گیا تھا۔ایک نقاب پوش نے ایک جھٹکے سے اس کے اوپر سے چادر کھینچ لی۔ تاریکی سے روشنی میں آتے ہی ایک پل کیلئے اس کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔آنکھیں ذرا روشنی سے مانوس ہوئیں تو اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔یہ ایک تہ خانہ تھا جس کے ٹھنڈے فرش پر وہ پڑی ہوئی تھی۔وہ دونوں نقاب پوش اسے اس کمرے میں ڈال کے کب کے جا چکے تھے۔کمرا بالکل خالی تھا۔صرف ایک کونے میں ایک کرسی پڑی تھی۔کوئی کھڑکی یا روشندان بھی نہیں تھا جو اجالے یا اندھیرے کا فرق بتا سکتا۔باہر نکلنے کے لیے چند سیڑھیاں اوپر چڑھ کر ایک دروازہ تھا جسے صرف باہر سے ہی کھولا یا بند کیا جا سکتا تھا کیوں کہ اندر کسی بھی قسم کی کنڈی نہیں لگی تھی۔اس کمرے کی چھت بھی کافی نیچی تھی۔عجیب گھٹن کا سا ماحول

تھا۔ پورے کمرے میں بس ایک بلب روشن تھا۔جس نے کمرے کو روشن کرنے کے ساتھ ساتھ وحشت ناک بھی بنا رکھا تھا۔

نوری کے ہاتھ پاؤں ابھی بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا بھی ٹھونسا ہوا تھا۔ یہاں سے فرار ہونے کی کوئی راہ نہیں تھی۔فرش پر آڑی ترچھی پڑی رہنے کی بجائے وہ خود کو گھسیٹتی دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔اس ویران اور خوفناک جگہ پر اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا، یہ سوچ کر ہی اس کے جسم میں سنسنی کی لہریں دوڑ گئیں۔اس نے چیخنا چاہا لیکن آواز اندر ہی گھٹ کر رہ گئی۔بس آنسو تھے جو آنکھوں کے رستے خاموشی سے بہتے جا رہے تھے۔وقت بنا کوئی چاپ اپنی وہی سست رفتار سے گزر رہا تھا لیکن نوری کے لیے تو وقت اس کالی اندھیری رات کی طرح رک سا گیا تھا۔ایک ایسی رات جس کی کوئی صبح نہیں تھی۔اسے اسی پوزیشن میں بیٹھے روتے نجانے کتنی دیر گزر چکی تھی۔اب تو رو رو کر آنسو بھی خشک ہو چکے تھے بس گالوں پر ان آنسوؤں کے نشانات رہ گئے تھے۔مسلسل ایک ہی جگہ بیٹھے اس کا سارا جسم اکڑ سا گیا تھا۔اس کے دونوں ہاتھ پشت پر کر کے باندھے گئے تھے اور پیروں کو بھی ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر باندھا گیا تھا۔ایسی صورتحال میں اٹھ کر کھڑا ہونا ہی بہت مشکل تھا اور چل سکنا تو ناممکن۔اس نے کوشش کر کے ٹانگوں کو سمیٹا اور پھر بندھے ہاتھوں سے دیوار کا سہارا لیتی اٹھ کھڑی ہوئی۔کھڑے ہوتے ہوئے اس نے دو تین گہرے سانس بھرے جیسے کوئی مشقت طلب کام کیا ہو۔اسی وقت فجر کی اذان ہونے کی ہلکی ہلکی سی آوازیں اسے سنائیں دینے لگیں۔اذان سن کر اس نے بے ساختہ آنکھیں بند کر لیں۔اس کے بہتے آنسو اور خاموش لب سراپا دعا بن گئے۔اذان ختم ہو گئی لیکن اس کے بے بس جسم کی لرزش اور دل سے نکلنے والی خاموش صداؤں اور التجاؤں میں کمی نہ آئی۔یونہی روتے روتے وہ دوبارہ فرش پر ڈھے سی گئی۔صبح ہو چکی تھی لیکن یہ صبح اس کی زندگی میں کتنی سیاہی گھولنے

والی تھی، یہ سوچ کر اس کی روح تک کانپ اٹھتی تھی۔ اس نے تھک کر دیوار کے سہارے سر ٹکا دیا اور آنے والی تباہی کا انتظار کرنے لگی کہ اس کے علاوہ تو وہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔

کچھ دیر کے بعد دروازے کے دوسری طرف اسے دو بھاری قدموں کی ٹھک ٹھک کرتی آواز سنائی دی اور اس کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا۔ دھڑکنوں کی رفتار میں ایک دم اضافہ ہو گیا تھا اور اس نے اپنی متوحش نظریں دروازے پر جما دیں۔ قدموں کی آواز آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی پھر ایک زوردار دھماکے سے دروازہ کھلا اور اس میں سے دلاور خان کا خباثت سے مسکراتا چہرہ نمودار ہوا۔ دلاور خان کو دیکھتے ہی اسے اپنے بدترین اندیشوں کے سچ ثابت ہونے کا یقین آ گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں خوف اور جسم کی لرزش میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ دلاور خان اندر آیا تو پیچھے دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ وہ نوری پر نظریں جمائے فاتحانہ کے انداز میں چلتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ نوری پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی ہر حرکت دیکھ رہی تھی۔ اس نے جیب سے ایک تیز دھار خنجر نکالا اور اس کے قریب پنجوں کے بل بیٹھ کر خنجر کی نوک اس کے گالوں سے لگا دی۔ نوک کی چبھن کے تکلیف دہ احساس نے نوری کو آنکھیں بند کر لینے پر مجبور کر دیا۔ دلاور خان خنجر پر اپنے ہاتھ کا دباؤ کم کرتے ہوئے اسے اس کے گالوں سے لے کر گردن اور جسم کے دوسرے حصوں پر سے پھیرتے ہوئے ٹانگوں پر لے آیا اور ایک ہی جھٹکے میں اس کے پاؤں پر بندھی رسی کاٹ دی۔ جھٹکا محسوس کر کے نوری نے فوراً ہی آنکھیں کھول دیں اور اپنے پیروں کو آزاد پا کر ایک دم اٹھی اور دیوار کے سہارے کھڑی ہو گئی۔ اس کے اٹھتے ہی دلاور خان بھی اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے منہ سے کپڑا کھینچ نکالا۔ اس سے پہلے کہ وہ چیخ پاتی اس نے چاقو کی نوک اس کے ہونٹوں سے لگا دی اور وہ ہونٹ کپکپا کر رہ گئی۔

''چیخنے کی غلطی مت کرنا کیونکہ یہاں سے میری مرضی کے بغیر تیری چیخیں تو کیا تیری

سانسیں بھی باہر نہیں جا سکتیں ..... اس لیے کوشش بے کار ہے لیکن اگر پھر بھی تو چاہے تو آزما لے مجھے کوئی اعتراض نہیں ..... ''اس نے ایک جھٹکے سے چاقو واپس کھینچا اور اس کا چہرہ دیوار کی طرف کر کے اس کے بندھے ہاتھ کھول دیئے۔ ہاتھ آزاد ہوتے ہی وہ تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی۔ اس نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ آرام سے اسے جانے دیا۔ اس کی گرفت سے نکلتے ہی نوری نے پنجرے میں قید بے بس پرندے کی طرح پروں کو پھڑ پھڑاتے باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن اس چھوٹے سے کمرے سے نکلنے کا ہر راستہ بند تھا۔ کچھ دیر پاگلوں کی طرح اِدھر سے اُدھر بھاگتے رہنے کے بعد وہ دیوار کے ایک کونے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ دلاور خان آرام سے کمرے کے بیچ میں کھڑا اس کی ساری بھاگ دوڑ دیکھ رہا تھا۔ اس نے چاقو بند کر کے واپس جیب میں رکھ لیا۔

''میں نے کہا تھا نا کوشش بے کار ہے ..... اور اب میرا صبر ختم ہو رہا ہے ..... '' اس کی آنکھوں میں ہوس کی سرخی ایک دم بڑھ گئی اور وہ ایک ماہر شکاری کی طرح نظروں ہی نظروں میں اسے تولتا اس کی طرف بڑھنے لگا۔

''مجھے جانے دے خان! ..... مجھے جانے دے ..... '' نوری نے اس کے تیور دیکھ کر روتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''جانے تو دوں گا لیکن ..... '' اس نے کمینگی سے ہنستے ہوئے اس کا ایک بازو پکڑ کر کھینچا اور اس کی پشت اپنے سینے سے لگا کر ایک ہاتھ سے اسے اپنے بازو میں جکڑا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی قمیص کا ایک پورا بازو پھاڑ ڈالا۔ نوری نے اس کے بازو میں تڑپتے ہوئے اپنے آپ کو چھڑانا چاہا لیکن اس کی گرفت کو مضبوط پا کر اس نے اپنے دانت اس کے بازو پر گاڑ دیئے۔ تکلیف کی شدت سے اس نے دھکا دے کر نوری کو خود سے الگ کیا تھا۔

''تیری اتنی مجال ..... ''اس نے لال انگارا ہوتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا

جبکہ ایک ہاتھ سے اس نے اس جگہ کو سختی سے دبایا ہوا تھا جہاں نوری کے دانتوں کے نشان پیوست تھے اور خون بھی رس رہا تھا۔ وہ جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھنے لگا۔

''رک جا دلاور خان!..... ورنہ ایک بے بس لڑکی کی آہ تجھے جلا کر خاک کر دے گی.....'' دلاور خان کے خطرناک ارادے اور اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نہ دیکھ کر بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''ہا..... اگر تجھے اتنا ہی یقین ہے تو یہ کوشش بھی کر کے دیکھ لے ..... دلاور خان کے علاقے میں تو کوئی پرندہ بھی اس کی اجازت کے بغیر پر نہیں مار سکتا تو تیری آہ کیا کرے گی'' اس نے پرغرور لہجے میں کہہ کر جھپٹنے کے سے انداز میں اس کو پکڑنا چاہا لیکن وہ فوراً ہی دوسری طرف ہوگئی۔

''اتنا غرور مت کر..... اس کی لاٹھی بے آواز ہے اور آج اسے تیرے غرور کو خاک میں ملانے کے لیے مجھ بے بس کی عزت بچانی ہی ہوگی..... آج چاہے یہ زمین پھٹے یا آسمان لیکن تیری ہوس کا نشانہ بننے سے پہلے اسے مجھے موت دینی ہی ہوگی..... آج موت ہم دونوں کو ہی آئے گی لیکن اس موت میں بھی ظالم کی ہار اور مظلوم کی جیت ہوگی'' نوری نے قدم پیچھے ہٹاتے ہوئے یقین سے پر لہجے میں کہا اور جیسے ہی اس کی پشت نے دیوار کو چھوا اس نے پورے اعتماد سے آنکھیں بند کر لیں اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگی۔ دلاور خان نے اسے ادھر اُدھر بھاگنے کی بجائے یوں مطمئن کھڑے دیکھ کر خوشی سے اُس کی طرف قدم بڑھائے اور پھر اُس نے نوری کے گریبان پر ہاتھ ڈالا..... اسی وقت اس کے قدموں کے نیچے موجود زمین کانپ اٹھی۔ دیواریں اتنے زور زور سے ہلنے لگیں جیسے ابھی اس پر آ گریں گی۔ دلاور خان نے دہشت زدہ ہو کر اپنے سر پر ہلتی چھت اور نوری کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں تو بند تھیں لیکن کپکپاتے ہونٹ ورد کے سے انداز میں ہل رہے تھے۔ اس وقت اس

کے چہرے پر ایک عجیب سا اطمینان پھیلا ہوا تھا۔خوف سے دلاور خان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور اس سے پہلے کہ وہ بھاگنے کے بارے میں سوچ پاتا۔زمین اتنی زور سے کانپی کہ اس میں دراڑیں پڑ گئیں اور تہ خانے کی چھت ان دونوں پر آ گری.....زلزلہ..... ہاں یہ زلزلہ ہی تو تھا۔کبھی کبھی زلزلے کسی مظلوم کی آبرو بچانے کیلئے بھی تو آتے ہیں اور آج.....

نوری...نوری! آنکھیں کھولو میں ہوں ہاشم اور یہ کیمپ ہسپتال ہے،تم ملبے سے صحیح سلامت نکال لی گئی ہو مگر تم اس تہ خانے میں گئی کیوں تھی؟''

ڈاکٹروں کی سر توڑ کوششوں نے نوری کو بچا لیا تھا لیکن اُس کے حواس ابھی پوری طرح بحال نہیں ہوئے تھے۔نوری تو بچ گئی مگر دلاور خان کا کوئی پتا نہ چل سکا وہ تو ملبے میں سے بھی نہ مل سکا تھا۔اس زلزلے میں پورے کے پورے گاؤں تباہ ہو گئے ،ہزاروں لاکھوں لوگ لاپتا ہو گئے تھے۔قدرت نے مظلوم کی آہ سن لی تھی،قدرت نے نوری کو بچا لیا تھا۔

پتہ نہیں کتنی نوریاں بچ سکیں اور کتنے دلاور خان تباہ ہو گئے،صحیح تعداد کا اندازہ نہیں لگایا جا سکا۔

☆ ☆ ☆

شیر زمان

''بانو! آخر تو سمجھتی کیوں نہیں.....'' زمان نے زچ ہو کر کہا۔ وہ پچھلے کئی دنوں سے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ تھی کہ کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

''کیا سمجھوں خان جی!.....میں ٹھہری ان پڑھ.....میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ ہم لوگ آپ کے بغیر نہیں رہ سکتے.....اور رہیں بھی کیوں جب آپ کی اس کارخانے والی نوکری سے اچھا بھلا گزارا ہو رہا ہے تو اتنی دور جانے کی کیا ضرورت ہے'' شہر بانو نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا اور کپڑے استری کرنے میں مصروف ہو گئی۔

''گزارا.....ہوں.....اسے تو گزارا کہتی ہے.....گھر کا خرچ مشکل سے پورا ہوتا ہے، بچت تو دور کی بات ہے.....اور پھر شیر زمان بھی اب بڑا ہو رہا ہے، تو نہیں چاہتی کہ وہ سکول جائے اور پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے'' زمان نے ساتھ ہی بیڈ پر بے خبر سوئے چار سالہ شیر زمان کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''شیر زمان ہی کیوں میں تو.....'' شہر بانو کے استری کرتے ہاتھ رک گئے اور اس کی نظریں کمرے سے باہر بچھے تخت پر ٹھہر سی گئیں۔ جہاں دونوں بچیاں اپنے ننھے منے ہاتھوں سے اپنی دادی کی ٹانگیں دبا رہی تھیں۔شہر بانو کو خود پڑھنے کا بہت شوق تھا لیکن وہ سکول نہیں جا سکی تھی۔بس دادا جی نے ہی اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے اسے تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا سکھا دیا تھا۔تب ہی تو زمان خان کی اماں نے اسے پسند کیا تھا کیوں کہ اگر زمان خان اپنی برادری میں میٹرک پاس کرنے والا پہلا شخص تھا تو وہ بھی برادری کی ساری لڑکیوں میں سے واحد پڑھی لکھی اور بے پناہ خوبصورت تھی۔اپنے خواب کی تعبیر اب وہ اپنے بچوں کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھی۔اس کی خواہش تھی کہ دونوں بیٹیوں کو سکول بھیجا جائے لیکن گھر کے مالی حالات نے اسے اپنی خواہشوں کا گلا گھونٹ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔

''کیا سوچنے لگی جھلیے!....کچھ مت سوچ، بس میرا ساتھ دے....بس ایک بار میں دوبئ پہنچ جاؤں پھر دیکھنا پیسا ہی پیسا ہوگا ہمارے پاس۔پھر شیر زمان ہی نہیں بلکہ دونوں بیٹیوں کو بھی ہم سکول داخل کروا دیں گے'' زمان نے ایسے کہا جیسے اس کے چہرے پر لکھی سوچ کی ہر لکیر پڑھ رہا ہو۔

''لیکن خان جی.....!'' وہ کشمکش کا شکار تھی،ایک طرف بچوں کا مستقبل تھا تو دوسری طرف شوہر کے اتنی دور چلے جانے کا ڈر۔

''لیکن ویکن چھوڑ تو.....قاسم کو دیکھا ہے۔کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے وہ.....کیا تھا اس کے پاس پہلے۔دوبئ کیا گیا سمجھو لاٹری نکل آئی اس کی تو۔کیا شاندار گھر بنوالیا ہے اور لوگ کیسے سیٹھ قاسم سیٹھ قاسم کہتے اس کے آگے پیچھے پھرتے ہیں'' قاسم کے نام پر اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی ابھر آئی تھی۔یہ قاسم ہی تو تھا جسے دیکھ کر اس پر بھی دوبئ جانے کی دھن سوار ہوگئی تھی۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے پر اماں اور ابا جی کبھی نہیں مانیں گے..... پہلے ہی ہاشو کے گھر والے تاریخ لینے کے لیے بڑا دباؤ ڈال رہے ہیں ان پر اور اوپر سے برادری والے بھی انھی کا ساتھ دے رہے ہیں'' اس نے نیم رضامندی کے انداز میں کہا۔

''ایک تو مامے کی مجھے سمجھ نہیں آتی۔اسے اچھا بھلا پتا ہے کہ ابھی چھ ماہ پہلے ہم تارا کی شادی کر کے فارغ ہوئے ہیں،اب اتنی جلدی نوری کی کیسے کر سکتے ہیں.....ماما تو بس ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتا ہے۔خیر تو فکر نہ کر میں سارے مسئلے نمٹا کر ہی جاؤں گا'' زمان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''چلو.....جیسے رب سوہنے کی مرضی.....'' اس نے گہرا سانس بھرا اور دوبارہ استری کرنے میں مشغول ہوگئی۔

وہ قاسم کی طرف جانے کے ارادے سے تیار ہو کر کمرے سے نکلا تو ابا جی اور اماں کو سوچوں میں گم تخت پر بیٹھا دیکھ کر ان کے پاس چلا آیا۔

''کیا بات ہے اماں!.....آپ کچھ پریشان سی لگ رہی ہیں؟'' وہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''پریشانیوں نے تو جیسے اس گھر کا رستہ ہی دیکھ لیا ہے.....ایک ختم نہیں ہوتی کہ دوسری آ ٹپکتی ہے'' انھوں نے ایک ہاتھ سے سر پکڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''آپ پریشان مت ہوں۔سب ٹھیک ہو جائے گا''

''کیسے ٹھیک ہوگا؟.....تیرے ماما، مامی کل پھر آ رہے ہیں.....وہ تاریخ مانگیں گے اور ہم خالی ہاتھ ہیں''انھوں نے مایوسی سے کہا۔

''آپ ان سے کسی طرح صرف تین مہینے کا وقت لے لیں.....تین مہینے بعد وہ جس دن،جس تاریخ کو کہیں گے ہم شادی کر دیں گے'' زمان نے کچھ سوچتے ہوئے فیصلہ کن

انداز میں کہا۔

''وقت تو ہم لے لیں گے لیکن اتنی جلدی پیسوں کا انتظام کیسے ہوگا'' انھوں نے کسی قدر چونک کر پوچھا۔

''پیسوں کا انتظام بھی ہو جائے گا اور ہماری ساری مشکلیں بھی دور ہو جائیں گی'' اس نے اتنے یقین سے کہا کہ وہ دونوں ہکا بکا ہو کر ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔

''زمان خان.....آخر تو کرنے کیا جا رہا ہے'' اتنی دیر سے خاموش بیٹھے ابا جی نے پہلی بار لب کھولے تھے۔

''میں نے فیصلہ کر لیا ہے ابا جی!.....میں دوبئ جاؤں گا..... یہاں کما کر دیکھ لیا ہے کہ ایک بہن کی شادی کر کے ہی ہم خالی ہاتھ ہو چکے ہیں۔آج نوری کی شادی کا مسئلہ ہے کل کو میری بیٹیوں کی باری آئے گی تو کیا ہوگا.....کب تک ہم اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کا گلا گھونٹتے رہیں گے'' وہ روانی میں بولتے بولتے ان کے حیرت سے گنگ چہرے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

''تو کیوں ہم بوڑھوں کی بڑھاپے کی لاٹھی بھی چھین لینا چاہتا ہے'' ابا جی نے غمزدہ لہجے میں کہا۔

''نہ بیٹا! ایسا ظلم نہ کر.....جیسے تیسے روکھی سوکھی کھا کر ہم کچھ نہ کچھ کر لیں گے لیکن تُو کہیں دور نہ جا....'' وہ ایک ماں تھیں اس لیے فوراً ہی تڑپ اٹھیں اور آنکھوں سے آنسو بھی بہ نکلے۔

''اماں! میں اپنے لیے تو نہیں جا رہا.....آپ ہی لوگوں کے لیے جا رہا ہوں.....کیا آپ نہیں چاہتیں کہ ہم بھی ایک اچھی اور پرسکون زندگی جئیں.....'' اس نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

''لیکن.....'' ان کے آنسو لفظوں پر قفل بن گئے۔

''ابا جی! آپ سمجھاؤ نا اماں کو.....''

''جب تو فیصلہ کر ہی چکا ہے تو ہمارے اجازت دینے یا نہ دینے سے کیا فرق پڑے گا'' ان کے لہجے میں خفگی کا عنصر نمایاں تھا۔

''یہ فیصلہ میرا نہیں حالات کا ہے او پھر سب کچھ آپ کے سامنے ہے۔اگر یونہی ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو ہم اس سال کیا اگلے دس سالوں میں بھی نوری کی شادی نہیں کر پائیں گے'' اس نے کسی قدر تلخی سے کہا۔

''ایسے نہ بول.....آخر تارا کی شادی بھی تو کی ہے ہم نے'' اماں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''لیکن زندگی بھر کی جمع پونجی خرچ کر کے.....اور اگر ایسے ہی نوری کی بھی کرنی ہے تو اگلے دس پندرہ سالوں میں ہی ہو سکے گی،اس سے پہلے نہیں''

وہ آج سارے حقائق ان کے سامنے لے آنا چاہتا تھا پھر چاہے وہ تلخ ہی کیوں نہ ہوں۔اور ان تلخ حقیقتوں سے تو وہ بھی واقف تھے بس اب تک ان حقائق سے نظریں چراتے آئے تھے لیکن آج جب زمان نے ان حقائق سے ان کا سامنا کروایا تھا تو وہ بھی خود کو بے بس اور مجبور پا رہے تھے۔

''جانے دے اسے.....شاید اسی میں ہم سب کی بہتری ہے'' ابا جی نے بڑے ہی کمزور سے لہجے میں کہا اور اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔

''اماں .....!'' زمان نے اجازت طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھا تو انھوں نے بے ساختہ ہی اسے گلے لگا لیا۔

☆ ☆ ☆

جب سے اس کے دوبئ جانے کا پتا چلا تھا ،گھر کی فضا میں اداسیاں سی رچ بس گئی تھیں۔ وہ شام کو گھر لوٹا تو خلاف معمول تخت خالی تھا۔اماں اور ابا جی دونوں ہی شاید اپنے کمرے میں تھے۔گھر میں ایک عجیب سی خاموشی طاری تھی ،بس بچوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو اپنے کھیل میں مشغول تھے۔ حالانکہ نوری بھی وہیں بیٹھی رومال پر کچھ کڑھائی کر رہی تھی۔ ورنہ تو وہ بھی اکثر بچوں کے ساتھ بچہ بن جایا کرتی تھی لیکن آج وہ بھی خاموش تھی۔اس نے نوری کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ پھر اس نے باری باری تینوں بچوں کے ماتھے پر بوسے دیئے اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔

''لالا!.....کیا آپ سچ مچ جا رہے ہو؟''نوری نے اچانک لب کھولے۔

زمان نے پلٹ کر دیکھا تو وہ آنکھوں میں آنسو لیے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے کچھ بھی نہ کہہ سکا بس ایک زخمی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آ کر معدوم ہوگئی اور وہ تھکے تھکے سے قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔اس نے دروازہ بند کیا اور کرسی پر ڈھے سا گیا۔گھر والوں سے دوری کا احساس اسے بھی اندر ہی اندر سے کاٹ رہا تھا لیکن اس دوری میں ہی اس کے ہر خواب کی تعبیر تھی۔ بس یہی سوچ اسے کمزور نہیں پڑنے دے رہی تھی۔

''خان جی!....''

وہ بڑی ہی گہری سوچ میں گم تھا کہ شہر بانو کی آواز سن کر چونک اٹھا۔ وہ ہاتھ میں قہوہ لیے اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''ہاں.....'' اس نے قہوے کی پیالی اس کے ہاتھ سے لے لی اور آہستہ آہستہ چسکیاں بھرنے لگا لیکن اس کے ماتھے پر سوچ کی گہری لکیریں اب بھی موجود تھیں۔

''کیا بات ہے خان جی!.....آپ کچھ پریشان لگ رہے ہو؟'' شہر بانو اسے پریشان

دیکھ کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''پریشان تو نہیں ہوں.....بس سوچ رہا تھا کہ پیسوں کا انتظام کیسے کروں''

''لیکن آپ تو کہہ رہے تھے کہ سیٹھ قاسم آپ کے جانے کے انتظامات کروا رہا ہے تو پھر اب یہ.....''اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''صرف جانے کے.....اس نے مجھے ان لوگوں سے ملوا دیا ہے جن کے ذریعے وہ خود دوبئ گیا تھا۔وہ لوگ یہی کام کرتے ہیں۔اب وہ مجھے دوبئ لے جانے کے لیے تو راضی ہیں لیکن پاسپورٹ، جہاز کا ٹکٹ اور جو بھی خرچ ہے وہ تو مجھے ہی دینا ہوگا نا''اس نے قہوے کا آخری گھونٹ بھر کر پیالی شہر بانو کو پکڑا دی۔

''لیکن اتنے سارے پیسے آئیں گے کہاں سے؟''اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

''پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ سیٹھ قاسم سے ہی قرض کے لیے کہوں گا لیکن.....آدمی جتنا بڑا ہوتا جاتا ہے،اس کا ظرف اتنا ہی چھوٹا ہوتا جاتا ہے''اس نے پھیکی سی ہنسی ہنس کر کہا۔

''میں سمجھی نہیں'' اس نے الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

''تو چھوڑ اسے.....میں نے خان لالا سے بات کر لی ہے اور وہ.....'' اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑی۔

''وہ.....وہ تو بیاج اصل سے بھی زیادہ لیتا ہے اور آپ'' شہر بانو اس سے قرض لینے کے حق میں نہیں تھی۔

''جانتا ہوں میں لیکن اور کوئی راستہ بھی تو نہیں ہمارے پاس.....اگر ہے تو تو بتا دے میں نہیں لیتا اس سے قرض'' اس نے غصے میں ذرا چڑ کر کہا تو وہ ایکدم خاموش ہوگئی۔

''دیکھ بانو!.....اس وقت ہماری مجبوری ہے اور اس کے علاوہ کوئی فرد ایسا نہیں جس سے ہمیں قرض مل سکے.....لیکن میری اصل پریشانی یہ نہیں بلکہ اس کی ایک شرط ہے جس

نے مجھے اتنا سوچنے پر مجبور کر دیا ہے'' اسے چپ ہوتے دیکھ کر زمان نے نرم لہجے میں کہا۔

''کیسی شرط؟.....'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''وہ پیسے دینے پر تو تیار ہے لیکن رقم اتنی بڑی ہے کہ....وہ اس گھر کے کاغذات اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے'' اس نے ذرا ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''کیا.....یہ کیا کہہ رہے ہو خان جی....؟ آپ ہمارے سر سے چھت بھی چھین لینا چاہتے ہو'' وہ حیران ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بانو! تو ادھر بیٹھ..... پہلے میری پوری بات تو سن لے.....''اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے دوبارہ بٹھالیا۔

''اب سننے کو رہ ہی کیا گیا ہے.....آپ خود تو جا رہے ہو اور اگر پیچھے اس نے پیسوں کا تقاضا کر دیا یا گھر خالی کرنے کو کہا تو.....؟''وہ اندیشوں کا شکار نظر آ رہی تھی۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا.....میں با قاعدہ لکھت پڑھت کروا کے ہی کاغذات اس کے حوالے کرونگا''اس نے تسلی دینی چاہی۔

''آپ ایک بار پھر سوچ لو.....میرا دل تو نہیں مانتا....''

''میں نے سوچ لیا ہے''اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''اور ابا جی....وہ مان گئے؟''اچانک ایک خیال کے تحت اس نے پوچھا۔

''انھیں یہ تو پتا ہے کہ میں خان لالہ سے قرض لے رہا ہوں لیکن گھر کے کاغذات دینے والی بات میں نے انھیں نہیں بتائی.....اور بانو تو بھی انھیں کچھ مت بتانا ورنہ وہ تو اسے دل پر ہی لے لیں گے.....تو تو جانتی ہے کہ یہ ہمارا آبائی گھر ہے اور انھیں کتنا عزیز ہے'' زمان نے لجاجت سے کہا تو وہ کچھ بول ہی نہیں پائی بس خاموشی سے سر جھکا کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

۷ اکتوبر ۲۰۰۵ء

8:45 a.m

شہر بانو اپنے میاں خاں جی کا باقی رہ جانے والا سامان پیک کر رہی تھی اور ساتھ ہی وقفے وقفے سے بہتے آنسو بھی دوپٹے کے پلو سے پونچھتی جا رہی تھی۔ زمان نہا کر تولیے سے بالوں کو رگڑتا کمرے میں آیا تو اس کے چہرے پر آنسوؤں کی لکیر دیکھ کر تیزی سے بالوں میں چلتے اس کے ہاتھ رک گئے۔

''یہ کیا بانو.....؟ اگر تو اس طرح روئے گی تو میں کیسے جا پاؤں گا'' اس نے تولیا منجھے پر اچھالا اور اس کے پاس چلا آیا۔

''میں آپ کو روک تو نہیں رہی'' اس نے دوپٹے کے پلو سے زور سے آنکھیں رگڑتے ہوئے بھیگے لہجے میں کہا۔

''لیکن تیرے یہ آنسو مجھے جانے بھی تو نہیں دیں گے....'' اس نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اپنی طرف گھما ڈالا اور ایک ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا تو مسلسل رونے کی وجہ سے بانو کی گلابی رنگت سرخی مائل ہو چکی تھی۔

''دیکھ اگر تو ایسے ہی کرے گی تو میں جا نہیں پاؤں گا'' زمان نے اس کے چہرے پر آئی ایک شریر لٹ کو نرمی سے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''تم مت جاؤ نا.....'' وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر رو پڑی۔

''میں خود بھی تم لوگوں کو چھوڑ کر کب جانا چاہتا ہوں لیکن ایک پر آسائش زندگی گزارنے کے لیے تم لوگوں سے دوری کا یہ کڑوا گھونٹ مجھے پینا ہی پڑے گا'' اس نے ہولے ہولے اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔

''ہمیں نہیں چاہیے آسائشیں.....ہم جیسے ہیں، ٹھیک ہیں.....جو ہمارے نصیب کا

ہے وہ ہمیں یہاں بھی مل جائے گا'' اس نے ذرا ضدی لہجے میں کہا۔

'' اب تک نصیب کا ہی تو ملتا آیا ہے.....لیکن اب میں اپنا نصیب خود بنانا چاہتا ہوں.....'' اس نے پرعزم لہجے میں کہتے ہوئے بہت نرمی سے اسے خود سے علیحدہ کر دیا۔

'' کفر نہ بولو خان جی!.....نصیب بنانا کب انسان کے ہاتھ میں ہے۔ وہ تو رب سوہنا ہی طے کرتا ہے'' اس نے جلدی سے کہا۔

'' تو پھر سمجھ لے کہ میرا جانا بھی اسی نے طے کیا ہے'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ لاجواب ہوگئی اور خاموشی سے دوبارہ پیکنگ کرنے لگی۔ اسے مصروف دیکھ کر وہ بھی اپنی تیاری میں مشغول ہوگیا۔

9:50 a.m

وہ اپنا بیگ اور سوٹ کیس لیے کمرے سے نکلا باہر نوری اور بچوں کے ساتھ ساتھ تارا اور اس کا شوہر اور برادری کے کافی سارے لوگ اماں ابا جی کے تخت کے گرد جمع تھے۔ کمرا تقریباً بھرا پڑا تھا۔ وہ سب لوگ جو آپس میں چہ مگوئیوں میں مصروف تھے اسے دیکھتے ہی ایکدم خاموش ہوگئے۔ تارا کے شوہر نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے سوٹ کیس اور بیگ لے لیا۔ باری باری سب سے مل کر وہ اماں کے پاس آیا تو اسے دیکھ کر ان کی ہچکیاں بندھ گئیں اور اسے انھیں چپ کروانا محال ہوگیا۔

'' اماں! میں جلدی لوٹ آؤنگا.....اور پھر یہ سب ہیں نا آپ کا خیال رکھنے کے لیے۔ دیکھنا یہ وقت کیسے گزر جائے گا پتا بھی نہیں چلے گا'' کتنی ہی دیر وہ انھیں سینے سے لگائے تسلیاں دیتا رہا لیکن ان کے آنسو تھے کہ تھمنے میں ہی نہیں آرہے تھے۔ آخر تارا نے آگے بڑھ کر اپنی اماں کو زمان سے علیحدہ کیا۔ مگر اماں روئے جارہی تھی۔

'' اماں! اس طرح تو آپ لالا کا جانا اور مشکل بنا رہی ہیں.....اگر آپ ہمت ہار

جائیں گی تو انھیں حوصلہ کون دے گا..... یہاں تو ہم سب ہیں آپ کے ساتھ، جبکہ لالا تو وہاں بالکل اکیلے ہونگے.....ہمیں تو انھیں خوشی خوشی وداع کرنا چاہیے تاکہ وہ وہاں جا کر دکھی نہ ہوں'' تارا نے ان کے آنسو پونچھ کر انھیں سمجھاتے ہوئے کہا حالانکہ آنکھیں تو اس کی بھی آنسوؤں سے لبریز تھیں لیکن ماں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے وہ خود پر بہت ضبط کر رہی تھی۔اماں کو یوں روتے دیکھ کر زمان کا اپنا ضبط بھی جواب دے گیا تھا۔اسی لیے جب وہ ابا جی سے گلے ملا تو چپکے سے دو آنسو اس کے گالوں سے لڑھک کر ان کے کندھے میں جذب ہو گئے۔

''اپنا خیال رکھنا'' اس سے الگ ہوتے ہوئے انھوں نے بھیگے لہجے میں کہا۔

'' آپ بھی'' اس نے آہستہ سے کہا اور اس کی نظر دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی آنسو بہاتی بانو پر پڑی تو وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کرتا پلٹ کر جانے لگا کہ شیر زمان روتا ہوا اس کے پیروں سے لپٹ گیا۔اسے روتا دیکھ کر اس نے فوراً ہی اسے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔اس کی گود میں آنے کے باوجود بھی وہ روتا ہی جا رہا تھا شاید اسے بھی اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر دور جا رہا ہے۔اس نے شیر زمان کو گود سے اتارنا چاہا تو وہ مچلنے لگا۔اس نے زبردستی اسے نوری کے حوالے کیا۔دونوں بچیوں کو پیار کیا اور ایک الوداعی نظر بانو پر ڈال کر تیز تیز قدموں سے چلتا باہر نکل گیا۔اس نے پلٹ کر ان کے اداس چہروں کو دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی کہ کہیں انھیں دیکھ کر وہ کمزور نہ پڑ جائے۔

12:45 p.m

وہ تو چلا گیا تھا لیکن آنسو تھے کہ تھمنے میں ہی نہیں آ رہے تھے۔

''اماں! اگر آپ اسی طرح روتی رہیں گی تو کیسے کام چلے گا.....دیکھیے ذرا بچوں کی

طرف.....کیسے سہمے سے بیٹھے ہیں'' تارا نے انھیں بار بار اپنی آنکھیں رگڑتے دیکھ کر کہا تو انھوں نے سہمی سہمی آنکھوں سے اپنی طرف دیکھتی بچیوں کو اپنے پاس بلایا اور سینے سے لگا لیا۔

''دعائیں دے دعائیں....رونے سے وہ واپس نہیں لوٹنے والا....'' ایک خاتون نے اٹھتے ہوئے ناک سکیڑ کر کہا اور باہر کی طرف چل دی۔

''ہاں بھئی سنا ہے کہ جس کے قدم ایک بار پردیس کی مٹی پر پڑ جائیں تو پھر وہ مشکل سے ہی واپس پلٹتے ہیں'' ایک اور دوسری خاتون لقمہ دے کر اٹھ کھڑی ہوئیں تو تارا کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔

''چاچی !تم تو رہنے ہی دو.....ایک تو اماں ویسے ہی پریشان ہیں ،تم انھیں اور ڈرا رہی ہو''

''لو بھلا بتاؤ میں نے کیا کہا.....ابھی ماں جایا پردیس پہنچا بھی نہیں کہ اتنی زبان لگ گئی ہے....بعد کی تو رب ہی جانے....'' اسی خاتون نے منہ بناتے ہوئے کہا اور چلی گئی۔

آہستہ آہستہ برادری کے باقی لوگ بھی اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ظہر کی اذان ہو رہی تھی۔اماں اور ابا جی دونوں ہی نماز کے ارادے سے اٹھ گئے۔

''میں بھی چلتی ہوں نوری!.....تو اماں کا خیال رکھنا'' تارا بھی جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آج مت جاؤ....یہیں رہ جاؤ....'' نوری نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''نہیں مجھے جانا ہوگا ورنہ بی جی ناراض ہو جائیں گی۔پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے.....انھوں نے تو کہا تھا کہ لالا کے رخصت ہوتے ہی آجاؤں'' اس نے اپنی مجبوری بیان کی تو وہ بھی چپ کر گئی۔بی جی کتنی سخت مزاج تھیں یہ تو وہ بھی اچھی طرح جانتی تھی۔

نوری سے مل کر وہ شہر بانو کے پاس چلی آئی جو کمرے کی چوکھٹ سے ٹیک لگائے کسی گہری سوچ میں گم بیٹھی تھی۔ تارا نے آہستہ سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو وہ چونک اٹھی۔

''تاراتو.....'' وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

''گھر جارہی ہوں.....بس اتنا کہنے آئی تھی لالا کے واپس آنے تک آپ کو ہی اس گھر کو سنبھالنا ہے.....سب کا خیال رکھنا ہے...اور اپنا بھی.....'' اس نے اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈال کر اس کا حوصلہ بڑھایا تو شہر بانو نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

4:45 p.m

افطاری کا وقت قریب تھا۔شہر بانو عصر کی نماز پڑھ کر کچن میں جانے لگی تو نوری کو اکیلے گم صم تخت پر بیٹھے دیکھ کر اس کے پاس چلی آئی۔

'' نوری!....ایسے کیوں بیٹھی ہے یہاں.....عصر کا وقت کم ہوتا ہے، پتا ہے نا تجھے...؟''

''لالا کی بہت یاد آرہی ہے'' اس نے یوں کہا جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔

''ہاں....وہ تو سب کو ہی آرہی ہے لیکن اس طرح اداس رہ کر تو اتنا لمبا وقت نہیں کٹے گا نا'' وہ ایک گہرا سانس بھر کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''تو پھر کیسے کٹے گا؟'' اس نے معصومیت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ایک دوسرے کا سہارا بن کر.....ایک دوسرے کی ہمت بن کر....اور ایک دوسرے کو حوصلہ دے کر....'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی تو نجانے کہاں سے دو آنسو گالوں پر لڑھک آئے۔اس نے فوراً ہی انھیں ہتھیلی کی پشت سے پونچھ ڈالا اور نوری نے دیکھ کر بھی نظر انداز کر دیا۔

''چلو اماں کو دیکھ کر آتے ہیں۔وہ دوپہر سے اب تک کمرے سے باہر نہیں نکلیں''
شہر بانو نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے دروازہ دھکیل کر اندر جانا چاہا لیکن اندر سے آتی آوازوں نے اس کے قدم روک لیے۔

''ماں ہوں میں بڑے خان!.....پہلی بار بیٹا مجھ سے اتنی دور گیا ہے،اتنی جلدی تو دل کو قرار نہیں آنے والا....بیٹے سے جدائی کی تڑپ کیا ہوتی ہے یہ ایک ماں ہی جانتی ہے'' انھوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''رب جانے یہ مجبوریاں ہم جیسے لوگوں کے ہی پیروں کی بیڑیاں کیوں بنتی ہیں.....وہ ایک کمانے والا اور ہم اتنی جانیں کھانے والی....ہمارے پیٹ کے دوزخ بھرنے ہی تو گیا ہے وہ اتنی دور'' ابا جی کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی تو ان دونوں کو اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی اور وہ خاموشی سے پلٹ آئیں۔

10:45 p.m

وہ تینوں بچوں کے ساتھ بیڈ پر لیٹی انھیں سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔دونوں بچیاں تو اس کے بہلانے سے سو گئی تھیں لیکن شیر زمان کسی طرح بھی سونے پر آمادہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے زمان کے ساتھ لپٹ کر سونے کی عادت تھی اور وہ جتنا اسے بہلانے کی کوشش کر رہی تھی وہ اتنا ہی ضد کر رہا تھا۔

''بابا کا شیر بیٹا ہے نا.....چلو جلدی سے آنکھیں بند کرو..''شہر بانو نے ایک اور کوشش کی۔

''پھر بابا آ جائیں گے''اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ہاں لیکن پہلے آنکھیں بند کرو''اس نے اس کے بالوں میں آہستہ آہستہ انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تو اس نے جھٹ آنکھیں بند کر لیں اور شہر بانو نے سکھ کا سانس لیا لیکن

تھوڑی ہی دیر بعد وہ دوبارہ آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''بابا کہاں ہیں؟''

''ایسے بار بار آنکھیں کھولو گے تو بابا نہیں آئیں گے''اس نے تنگ آ کر ذرا سخت لہجے میں کہا تو وہ فوراً ہی آنکھوں میں آنسو لے آیا۔زمان کا وہ بے حد لاڈلا تھا اور وہ تو اس کی آنکھوں میں آنسو برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے۔بس یہی سوچ کر اس نے اٹھ کر شیر زمان کو سینے سے لگا لیا اور پھر اسے ہولے ہولے تھپکتے ہوئے اسے زمان کے آنے کا یقین دلاتی رہی۔آخر تھک ہار کر وہ بھی سو گیا۔اسے لٹا کر وہ خود بھی لیٹ گئی لیکن نیند تو جیسے آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔شادی کے اتنے برسوں میں یہ پہلی رات تھی کہ وہ اس کمرے میں تنہا تھی۔زندگی میں اچانک ایک خالی پن سا آ گیا تھا۔ساری رات اس کی یونہی کروٹیں بدلتے گزر گئی۔

۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء

3:45 a.m

بانو سحری کے وقت اٹھی تو سر بہت بھاری ہو رہا تھا،آنکھوں میں بھی سرخی چھائی ہوئی تھی۔اس نے سب سے پہلے غسل خانے میں جا کر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے منہ پر مارے تو اسے کافی فرحت محسوس ہوئی۔منہ دھو کر بالوں کا اس نے جوڑا باندھا اور کچن میں چلی آئی۔ نوری آج خلاف معمول پہلے ہی سے کچن میں موجود تھی اور قہوہ تیار کر رہی تھی۔اس کی آنکھوں میں موجود ہلکی سی سرخی اس بات کی گواہ تھی کہ اس نے بھی ساری رات سوتے جاگتے ہی گزاری ہے۔دونوں نے ہی ایک دوسرے کی آنکھیں دیکھ کر نظریں چرائیں اور خاموشی سے اپنے اپنے کام میں مشغول ہو گئیں۔

دستر خوان پر کھانا لگا کر نوری جا کر اماں اور ابا جی کو بلا لائی۔وہ چاروں اپنی اپنی جگہ پر

اتنی خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہاں کوئی ذی روح موجود بھی ہے۔ نظریں بار بار بھٹک کر زمان کی خالی نشست پر جا ٹھہرتی تھیں اور نوالہ حلق میں اٹکنے لگتا تھا لیکن وہ چاروں ہی ایک دوسرے کا حوصلہ بنے خود پر ضبط کیے بیٹھے تھے۔

''بانو!.....کیا کہا تھا اس نے .....کب پہنچے گا کراچی....؟'' اماں نے اچانک لب کھولے۔

''کراچی تو وہ رات کو ہی پہنچ گئے ہونگے.....اب تو دوبئ پہنچنے والے ہونگے'' شہر بانو نے کہا تو وہ ہاتھ میں پکڑا نوالہ چھوڑ کر اٹھ گئیں۔

''ارے اماں آپ.....؟'' نوری انھیں اٹھتا دیکھ کر خود بھی اٹھ گئی۔

''بس مجھ سے اور نہیں کھایا جائے گا'' ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تھے۔ وہ سب سے نظریں چراتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ شہر بانو کے اشارے پر نوری بھی ان کے پیچھے چلی گئی۔ ان کے جاتے ہی ابا جی نے بھی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور اپنی قہوے کی پیالی لیکر تخت پر جا بیٹھے۔ بھوک تو اسے بھی نہیں لگ رہی تھی۔ اس لیے اس نے برتن سمیٹنے شروع کر دیئے۔ برتن سمیٹ کر ابھی فارغ ہی ہوئی تھی کہ فجر کی اذانیں شروع ہو گئیں۔

نماز سے فارغ ہو کر وہ سب اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے اور سونے کی کوشش کرنے لگے۔ ساری رات آنکھوں میں کٹی تھی اور اب کھانے کا بھی خمار تھا۔ اس لیے نیند ان پر حاوی ہونے لگی اور وہ سب نیند کی گہری وادی میں جا اُترے.....

☆ ☆ ☆

جہاز نے ٹھیک ساڑھے نو بجے دوبئ ائیر پورٹ پر لینڈ کیا تھا۔

''اب ہر خواب کی تعبیر میری مٹھی میں ہو گی'' زمان نے جہاز کی سیڑھیاں اترتے ہوئے پر عزم انداز میں آسمان کی طرف دیکھ کر سوچا اور پر اعتماد انداز میں چلتا ہوا نیچے اتر

آیا۔سامان وغیرہ کی کلیرنس کرا کے پیسنجر زلاؤنج میں پہنچتے پہنچتے اسے تقریباً بیس منٹ لگ گئے۔لاؤنج میں ٹیلی ویژن سیٹس کے گرد لوگوں کا ہجوم اوران کے پریشان حال چہرے دیکھ کر متجسس انداز میں وہ بھی ایک ٹی وی سیٹ کے قریب چلا گیا۔

''پاکستان میں آج صبح ۸بجکر ۵۰منٹ پر شدید زلزلہ آیا۔ریکٹر سکیل پر اس کی شدت ۶.۷ریکارڈ کی گئی ہے۔اس زلزلے سے شمالی علاقوں میں بہت بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی.....''

خبر سن کر اس کے ہاتھ میں پکڑا سوٹ کیس زمین پر گر پڑا۔کچھ ہی پل پہلے کیا گیا اس کا عزم قسمت نے ایک ہی وار میں مٹی کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا تھا۔وہ دیوانہ وار ٹکٹ کاؤنٹر کی طرف بھاگا تاکہ فوری طور پر واپسی کی ٹکٹ کروا سکے اور پھر بڑی تگ و دو کے بعد آخر اسے دو گھنٹے بعد کی فلائیٹ میں سیٹ مل ہی گئی تھی۔

دوبئی سے پہلے کراچی اور پھر کراچی سے اس کا واپس گھر تک کا سارا سفر دعائیں مانگتے ہی گزرا تھا۔شدید اضطراب تھا جس نے سارا راستہ اس کا گھیراؤ کئے رکھا لیکن جب وہ واپس پہنچا تو سب ختم ہو چکا تھا۔ہر طرف ایک افراتفری کا عالم تھا۔جس کے ہاتھ جو چیز لگی وہ اس کی مدد سے ملبے تلے دبی لاشیں نکالنے کی کوشش کر رہا تھا اور کچھ تو اس امید پر ہاتھوں سے ہی ملبہ ہٹا رہے تھے کہ شاید کوئی ایک سانس لے رہا ہو اور وہ اسے بچا پائیں لیکن زندگی اور موت کے اس کارزار میں زندگی تو کب کی دم توڑ چکی تھی۔کسی سے جینے کی وجہ چھین لی گئی تھی اور جس کے پاس وجہ تھی اس سے زندگی ہی چھین لی گئی تھی لیکن پھر بھی لوگ ایک موہوم سی امید کے سہارے ملبہ ہٹانے کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے لیکن زمان کے پاس تو یہ موہوم سی امید بھی نہیں بچی تھی کہ گھر کے سامنے پڑی سات لاشوں نے اس کے حواس ہی معطل کر دیئے تھے۔یہ تو وہ گھر ہی نہیں تھا جسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔یہ تو اندھی قبریں تھیں

جنھوں نے زندہ انسانوں کو نگل لیا تھا۔جن کی خاطر اس نے اتنے جتن کیے تھے.....جن کی خواہشوں کو پورا کرنے وہ اتنی دور چلا گیا تھا.....جن کے خوابوں کو تعبیر دینے کی آرزو اسے ان سے دور لے گئی تھی ۔وہ سب کے سب لاشوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔صدمے کی زیادتی سے وہ گنگ رہ گیا۔وہ شیر زمان بھی ایک منجھے پر بے جان پڑا تھا۔جسے بڑا ہوتا دیکھ کر اُسے دوبئی جانے کا خیال آیا تھا۔

''نہیں.....یہ میرا گھر نہیں.....کہاں ہے میرا گھر.....میرا گھر مجھے واپس دو.....واپس دو مجھے.....کہاں ہیں سب لوگ.....دیکھو اماں! میں آ گیا ہوں.....میں آ گیا ہوں ابا جی!.....کہاں ہیں آپ.....'' اچانک اس نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا اور پاگلوں کی طرح ہاتھوں سے ملبے کی مٹی ہٹانے لگا۔

زندگی سے چھیننے گئے خوشیاں
پاس تھا جو گنوا دیا وہ بھی

☆ ☆ ☆

تکمیل

''رباب!.....'' آذر نے اس کے ساتھ بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے اسے پیار سے پکارا لیکن وہ تو جیسے اس ایک لمحے میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی نظریں اب بھی ٹکٹکی باندھے خلاؤں میں گھور رہی تھیں۔ آذر لب بھینچ کر رہ گیا۔

''مجھے میرا بچہ واپس دے دو رباب میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی.....پچھلے پندرہ دن کیسے کانٹوں پر گزارے ہیں، یہ میں ہی جانتی ہوں.....جہاں باقی چار جانیں پل رہی ہیں وہیں، یہ بھی پل جائے گا۔ ہم روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کر لیں گے لیکن اب میں اپنے بچے سے دور نہیں رہ سکتی.....'' زاہدہ فریاد کرتی آنسو بہاتی اپنے بچے کو رباب سے لیکر چلی گئی اور رباب اپنی بانہیں پھیلائے گم صم دروازے میں کھڑی تھی۔

آذر لے پالک بچے سے اس کی جذباتی وابستگی سے بخوبی واقف تھا۔ اس لیے وہ جس کیفیت سے اس وقت گزر رہی تھی، اس کا اندازہ لگانا اس کے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن

وہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔اس نے دروازہ بند کیا اور اسے بازوؤں سے تھامے ہوئے لاؤنج میں لا کر بٹھا دیا۔

''رباب!.....میری جان!.....پلیز سنبھالو خود کو.....''

آذر نے اس کا چہرہ اپنی طرف گھماتے ہوئے کہا لیکن اس کی آنکھوں میں پتھریلا پن دیکھ کر بے اختیار اس نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور ہولے ہولے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

''تم خود بھی ایک ماں ہو رباب! اور وہ بھی.....خود کو اگر اس کی جگہ پر رکھ کر سوچو گی تو اس کے دکھ کو اپنے دکھ سے کہیں بڑا پاؤ گی۔تم نے تو صرف چند دن اسے اپنی آغوش میں رکھا ہے جبکہ اس کی ماں نے تو اسے اپنے خون سے سینچا ہے۔پھر تم ہی بتاؤ کیسے وہ اس کے لیے نہ تڑپے.....اس کی تڑپ،اس کے درد کا اندازہ کم از کم تم تو لگا سکتی ہو.....''

وہ بہت نرمی سے اسے سمجھا رہا تھا اور پھر شاید یہ اس کی محبت بھری قربت کا ہی اثر تھا کہ اس کے منجمد احساسات میں زندگی جاگ اٹھی اور وہ سسک اٹھی۔اس کے گرم آنسو آذر کو اپنے سینے پر نہیں بلکہ دل پر گرتے محسوس ہو رہے تھے۔

''لیکن آذر!.....اس نے تو اپنی خوشی سے.....اپنا بچہ میری جھولی میں ڈالا تھا.....پھر وہ اسے کیسے.....؟'' آنسوؤں کے درمیان اس سے جملہ مکمل ہی نہیں ہو سکا اور آذر نے اسے اپنی بانہوں کے مضبوط حصار میں جکڑ لیا۔

''بس رباب!.....اب اس بارے میں ہم کوئی بات نہیں کریں گے.....سمجھ لینا کہ وہ بچہ ہماری زندگی میں کبھی آیا ہی نہیں تھا۔جیسے ہم پچھلے چھ سالوں سے جی رہے ہیں،اب بھی جی لیں گے.....بچہ اڈاپٹ کرنے کی ضد تو تمھاری ہی تھی۔میں نے تو پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں کہ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم ماں بن سکتی ہو یا نہیں.....میرے لیے

تم ،تمھاری محبت اور ہمارا ساتھ کافی ہے زندگی جینے کو.....کاش تم جان پاتیں کہ تمھارے یہ آنسو مجھے کتنی تکلیف دیتے ہیں ۔تمھاری ایک مسکراہٹ کے لیے میں سو بار مرنے کے لیے تیار ہوں اور تم ہو کہ اپنی ایک کمی کے سامنے میری محبت کو بھی بھول بیٹھی ہو.....'' نہ چاہتے ہوئے بھی آخر میں اس کا لہجہ شکایتی سا ہو گیا تھا۔

'' سوری آذر! آئی ایم سوری.....میں ہمیشہ ہی انجانے میں تمھیں دکھ دے جاتی ہوں'' اس کا لہجہ ندامت لیے ہوئے تھا۔

آذر اس سے دیوانوں کی طرح محبت کرتا ہے یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی لیکن اپنے ماں نہ بن سکنے کی کمی کا احساس کبھی کبھی اتنی شدت سے اس پر حاوی ہو جایا کرتا تھا کہ وہ آذر کی بے پناہ محبت کو بھی فراموش کر بیٹھتی تھی حالانکہ شادی کے ان چھ سالوں میں آذر نے اسے کبھی اس کمی کا احساس تک نہیں ہونے دیا تھا لیکن اسے اپنے دل پر اختیار نہیں تھا ورنہ آذر نے جو اسے مان اور پیار دیا تھا وہ خود بھی اسے پوجنے کی حد تک چاہتی تھی۔

''صرف سوری سے کام نہیں چلے گا.....جا کر فوراً تیار ہو جاؤ۔ہم آج لنچ باہر کریں گے اور اس کے بعد لانگ ڈرائیو.....'' آذر نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی دھیمے سے مسکراتے ہوئے اس سے الگ ہو گئی اور پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

اس بات کو کافی دن گزر چکے تھے لیکن آذر محسوس کر رہا تھا کہ وہ اب بھی کچھ کھوئی کھوئی سی رہتی ہے ۔اکثر وہ اس سے دوران گفتگو جب کچھ پوچھتا تو وہ یوں چونک اٹھتی کہ جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔اس لیے آذر کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ وہ آفس سے جلدی گھر آ جائے اور آفس میں رہتے ہوئے بھی وہ دو تین بار اس سے فون پر ضرور بات کرتا تھا۔اس کی کوششوں سے اتنا ضرور ہوا تھا کہ آہستہ آہستہ ہی سہی لیکن وہ اس جذباتی صدمے سے باہر آ رہی تھی۔

اس دن آفس سے آنے کے بعد وہ شاور لے کر لاؤنج میں آ کر بیٹھا تو رباب اس کے لیے چائے لے آئی۔

''رباب!.....جلدی سے تیار ہو جاؤ۔آج ڈنر باہر کرتے ہیں.....''اس نے چائے کا ایک گھونٹ بھر کر کہا۔

''کوئی ضرورت نہیں ۔ابھی کل ہی تو باہر ڈنر کیا ہے....آج آرام سے گھر میں کھانا کھائیں'' رباب نے صاف انکار کر دیا اور سینٹر ٹیبل سے میگزین اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔

''یار!تم کیسی بیوی ہو.....بیویاں تو ہمیشہ ایسے مواقع کی تاک میں رہتی ہیں کہ کب مظلوم شوہر ہاتھ آئے اور وہ اس کا خرچ کروا سکیں اور یہاں مظلوم شوہر خود آفر کر رہا ہے اور جناب ہیں کہ انکاری ہو رہی ہیں''اس نے لہجے میں حد درجہ حیرت پیدا کرتے ہوئے کہا اور وہ ہنس پڑی۔

''بس بس رہنے دو.....تم اور تمھارے یہ ڈرامے.....اچھی طرح جانتی ہوں میں''

''کمال ہے یار!.....genuine بندے کی تو کوئی ویلیو ہی نہیں یہاں.....سوچا تھا آج بیوی کے ساتھ تھوڑا رومانس کریں گے لیکن.....ہماری ایسی قسمت کہاں''اس نے بیچارگی سے کہہ کر کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

''رومانس اور وہ بھی باہر جا کر .....یہ گھر چھوٹا پڑ گیا ہے کیا'' رباب نے آنکھیں دکھائیں۔

''ارے یار!سمجھا کرو نا.....ڈیٹ پر جا کر رومانس کرنے کا اپنا مزہ ہوتا ہے''اس نے ہنستے ہوئے آنکھ دبا کر کہا تو وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

''آذر!کچھ تو شرم کریں.....یہ ٹین ایجرز کی حرکتیں کب چھوڑیں گے آپ''

''جب تک ٹین ایج ہمیں نہیں چھوڑتی'' اس نے اطمینان سے کہا اور وہ مسکرا اٹھی۔
''باتوں میں تو آپ سے کوئی جیت ہی نہیں سکتا.....'' وہ میگزین میز پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
''صرف باتوں میں ہی نہیں بلکہ محبت کرنے میں بھی ہم سے کوئی نہیں جیت سکتا''
مجھ سا تجھ کو چاہنے والا اس دنیا میں کوئی اور ہو...اللہ نہ کرے..اس نے یہ گیت گنگناتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا اور وہ سرشاری میں اندر کی طرف بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

رات کو سونے سے پہلے کتاب پڑھنا اس کی پرانی عادت تھی۔ وہ جتنا بھی تھکا ہوا ہوتا، جب تک کسی اچھی سی کتاب کے ایک دو صفحے پڑھ نہیں لیتا تھا، اسے نیند نہیں آتی تھی اور اس کی یہ عادت اب تک برقرار تھی۔ وہ بیڈ پر نیم دراز فیض احمد فیض کی 'نسخہ ہائے وفا' پڑھنے میں مصروف تھا کہ رباب چلی آئی۔
''کیا پڑھ رہے ہیں۔ کچھ ہمیں بھی سنائیں'' رباب نے آذر کے سینے پر سر رکھ کر لیٹتے ہوئے کہا۔
''جو حکم جناب.....لیجیے سنیے.....

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے''

''زبردست.....ویسے جناب کے لہجے میں اتنا خمار ہے یا یہ ہماری محبت کا اعجاز ہے'' رباب نے شرارتی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''چانس مار لیتے ہیں، ابھی پتا چل جائے گا'' آذر نے بڑے معنی خیز انداز سے اس کی

طرف دیکھتے ہوئے کتاب سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی اور وہ اس کے ارادے بھانپ کر فوراً ہی اٹھ بیٹھی۔

''بس بس، زیادہ رومانٹک ہونے کی ضرورت نہیں.....مجھے معلوم ہے پہلے ہی''

''یار بیوی!.....تم بھی نا.....اچھے خاصے موڈ کا ستیاناس کرنے میں ایک منٹ نہیں لگاتی''اس نے ذرا خفگی سے کہا اور کتاب دوبارہ اٹھالی۔

''اچھا بابا! سوری۔آپ کا موڈ میں بعد میں ٹھیک کردوں گی....آئی پرامس....لیکن ابھی مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے''رباب نے اس کے ہاتھ سے کتاب چھین کر ٹیبل پر اچھال دی۔

''کیا بات ہے؟''آذر نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

'' آذر! .....وہ میں کہہ رہی تھی .....وہ نا .....''وہ نظریں جھکائے اپنی انگلیاں مروڑنے لگی۔

''کیا بات ہے رباب!.....کوئی پرابلم ہے کیا.....''اس کے غیر معمولی انداز نے اسے چونکا دیا تھا۔

'' آذر!.....کیوں نہ ہم کسی .....یتیم خانے سے بچہ گود لے لیں''اس نے ذرا جھجکتے ہوئے یاسیت بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوہ.....''بے اختیار ہی اس کے منہ سے ایک گہرا سانس نکل گیا۔

یہ بات رباب کے ذہن میں کس نے ڈالی ہوگی وہ فوراً ہی سمجھ گیا تھا کیونکہ کل ہی مسز خان اس سے مل کر گئی تھیں اور وہ ایک N.G.O چلانے کے ساتھ ساتھ بہت ہی سرگرم سوشل وومن تھیں۔

''آذر! پلیز.....''اس نے اتنی لجاجت سے کہا کہ وہ اسے انکار ہی نہیں کر پایا کیونکہ

وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ بچے کے معاملے میں بہت کچی ہے۔

''ٹھیک ہے.....سوچیں گے اس بارے میں....'' اس نے جیسے ہی کہا وہ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے اس کے سینے سے لپٹ گئی اور وہ اس کی معصومیت پر محض مسکرا کر رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

مسز خان نے ہی ان کی رہنمائی اس یتیم خانے تک کی تھی اور آج وہ دونوں یہاں موجود تھے۔ یہاں کافی بڑی تعداد میں مختلف عمروں کے بچے موجود تھے۔ رباب نے کافی دیکھ بھال اور سوچ بچار کے بعد آخر ایک بچہ پسند کر لیا۔ بچہ بمشکل چھ ماہ کا تھا لیکن تھا بہت پیارا۔ اس کی گہری بھوری آنکھوں اور لبوں پر کھیلتی مسکراہٹ میں ایک عجیب سی کشش تھی جس نے رباب کو فوراً ہی اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا۔ بچہ پسند کرنے کے بعد کچھ قانونی کارروائی ہونی تھی جس کے بعد بچے کی اڈاپٹیشن قانونی طور پر انھیں مل جاتی۔ اس کے لیے وہاں کی وارڈن نے ان سے ایک دن کا وقت مانگا تاکہ وہ اس سلسلے میں کاغذات تیار کروالے اور پھر بچہ ان کا ہو جائے گا۔ یہ ساری باتیں آذر مسز خان سے پہلے ہی ڈسکس کر چکا تھا، اس لیے وہ رباب کو لیکر گھر واپس آ گیا۔

اس نے رباب کو نہیں بتایا تھا لیکن یہ ساری قانونی کارروائی وہ خود کروا رہا تھا تاکہ پہلے کی طرح بعد میں کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو۔ حالانکہ اسے یہی بتایا گیا تھا کہ اس بچے کے پیرنٹس نہیں لیکن پھر بھی وہ کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا کیونکہ وہ رباب کی جذباتی حالت سے بخوبی واقف تھا۔ وہ ایک بار تو یہ سب سہہ گئی تھی لیکن دوسری بار بھی اگر کوئی ایسی ہی بات ہوئی تو شاید وہ سہہ نہ پائے۔

گھر آ کر بھی رباب سے اپنی خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ وہ جب سے گھر آئی تھی، بچے کے cot کے ساتھ ہی مصروف تھی۔ کبھی اس پر ایک کھلونا لٹکا رہی ہے تو کبھی

دوسرا۔کبھی بستر سنوارنے میں لگ جاتی۔اس وقت اس کے ہونٹوں پر ایک مستقل مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور آذر بیڈ پر نیم دراز اسے مسکراتے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

''کیا بات ہے جان آذر!.....آج تو تم مجھے بھی بھولی ہوئی ہو.....میں جیلس بھی ہو سکتا ہوں'' آذر نے اسے تنگ کرنے کے لیے شرارت سے کہا۔

''آذر! آپ بھی نا.....اپنے بچے سے بھی کوئی جیلس ہوتا ہے بھلا.....'' اس نے ہنستے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''بھئی ہم تو ہوں گے اگر تم نے ہمیں نظر انداز کیا تو.....ہم تو ایسے ہی ہیں.....''

''تو ہوتے رہیں جیلس ..... یہاں کسے پروا ہے'' وہ اس کی آنکھوں میں مچلتی شرارت دیکھ چکی تھی۔اس لیے بے فکری سے کہتی دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔

''اچھا جی تو یہ بات ہے.....ابھی بتاتا ہوں تمھیں.....'' آذر کو اس کے بے فکر انداز نے فوراً ہی جوش دلا دیا۔وہ ایک جھٹکے کے ساتھ بیڈ پر سے اترا اور اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔

''آذر!.....کیا کر رہے ہو.....چھوڑو مجھے.....'' وہ اس کے بازوؤں میں آتے ہی مچل اٹھی۔

''ارے ایسے کیسے چھوڑ دوں.....چھوڑنے کے لیے تو نہیں تھاما تھا تمھارا ہاتھ۔اب تو سانسوں کی ڈور ٹوٹے گی تب ہی یہ ساتھ چھوٹے گا'' آذر نے اسے بیڈ پر لٹاتے ہوئے کہا تو اس نے بے ساختہ ہی اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''کبھی کبھی بہت فضول بولتے ہیں آپ'' اس کا لہجہ خفگی لیے ہوئے تھا۔

''کبھی کبھی کی تو خیر ہے۔روز تو نہیں بولتا نا'' وہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتا، بیڈ کے سرہانے سے ٹیک لگائے، اس کے قریب ہی نیم دراز ہوگیا۔

''آذر!...''

''کہو جان آذر!.....خوش ہو؟....'' اس نے اس کے براؤن سلکی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''بہت..... پتا نہیں اس رات کی صبح کب ہوگی'' وہ کچھ زیادہ ہی پرجوش نظر آرہی تھی۔

''صبح تو تب ہوگی نا جب رات گزرے گی اور تم رات کو گزرنے کا موقع ہی نہیں دے رہی ہو'' اس نے بڑے ہی گہرے لہجے میں کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ جھینپ کر اس کے سینے سے لپٹ گئی۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن وہ دونوں مقررہ وقت پر یتیم خانے پہنچ گئے۔ آفس میں داخل ہوئے تو ان دونوں کو دیکھ کر وارڈن کے چہرے پر جو تاثرات ابھرے انہیں دیکھ کر آذر چونک گیا۔

''اگر آپ کی قانونی کارروائی پوری ہوگئی ہو تو کیا ہم بچے کو لے جا سکتے ہیں'' رباب بچے کو اپنی گود میں لینے کے لیے کچھ زیادہ ہی بے تاب ہو رہی تھی۔

''قانونی کارروائی تو ابھی پوری ہو جاتی، میں نے lawyer کو یہیں بلا لیا ہے لیکن آپ.....'' وہ کچھ کہتے کہتے ایکدم جھجک سی گئی۔

''لیکن کیا مسز سلیم!.....'' آذر بڑے غور سے ان کے چہرے پر پھیلی پریشانی کی ہلکی ہلکی لکیروں کو دیکھ رہا تھا۔

''ایکچوئیلی مسٹر آذر! ایک چھوٹی سی پرابلم ہوگئی ہے .....آپ کوئی اور بچہ دیکھ لیں..... میں ابھی ساری لیگل ڈاکومینٹیشن کروا کے بچے کی کسٹڈی آپ کو دلوا دیتی ہوں'' انھوں نے مسکرا کر اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے کہا اور رباب کے چہرے پر بکھرے خوشی کے رنگ ایکدم پھیکے پڑ گئے۔ اس نے بے بسی سے آذر کی طرف دیکھا تو آذر نے آہستہ سے اس کا ہاتھ دبا کر اسے آنکھوں کے اشارے سے حوصلہ رکھنے کو کہا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ چھوٹی سی پرابلم کیا ہے؟'' آذر نے چبھتی ہوئی نظروں سے وارڈن کی طرف دیکھا۔

''مسٹر آذر! اڈاپٹیشن میں اکثر ایسی چھوٹی موٹی پرابلمز ہوتی رہتی ہیں۔آپ کیا کریں گے جان کر۔میں آپ کو اس کی جگہ دوسرا بچہ تو دے ہی رہی ہوں'' مسز سلیم نے گول مول سے انداز میں جواب دیا۔

''اور اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ کی یہ چھوٹی موٹی پرابلمز اس بچے کے حوالے سے نہیں ہونگی'' اس کے انداز میں طنز نمایاں تھا۔

''اب آپ جرح کریں گے تو میں.....'' انھوں نے کسی قدر بیزاریت سے کہہ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

''آپ جرح کرنے کا موقع ہی نہ دیں.....صاف صاف وہ پرابلم بتا دیں کیونکہ ہمیں وہی بچہ چاہیے'' آذر نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''وہ بچہ ہمارے پاس نہیں.....کل شام ہی اس کے پیرنٹس اسے یہاں سے لے گئے'' آخر کار آذر کے پرزور اصرار نے انہیں سچ بتانے پر مجبور کر ہی دیا۔

''وٹ!.....لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ اس کے پیرنٹس زندہ نہیں ہیں'' آذر کو سخت شاک لگا جبکہ رباب کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔وہ ایک بار پھر وہیں آ کھڑی ہوئی جہاں سے چلی تھی۔خوشی ایک بار پھر اس کے دروازے پر دستک دے کر لوٹ چکی تھی۔

''ہمیں یہی بتایا گیا تھا لیکن ایکچوئیلی خاندانی دشمنی کے چکر میں اس بچے کو کڈنیپ کر کے یہاں پہنچا دیا گیا تھا۔اس بچے کے باپ کا فیملی بیک گراؤنڈ بہت سٹرونگ تھا،اس لیے پولیس کی مدد سے نہ صرف انہوں نے کڈنیپر کو ڈھونڈ نکالا بلکہ اپنے بچے تک بھی پہنچ گئے'' اسے غصے میں دیکھ کر مسز سلیم نے اسے پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

''میں اب یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جو بھی ہوا، بہت برا ہوا۔ بہر حال اس سارے پراسس میں بچہ اپنے اصلی ماں باپ تک پہنچ گیا، تھینکس گاڈ.....لیکن آپ لوگوں کو بھی اس معاملے میں خاصی احتیاط برتنی چاہیے۔ جو شخص بچہ چھوڑ کر جا رہا ہے اس کے بارے میں آپ کو معقول معلومات ہونی چاہئیں'' آذر اب تھوڑا نرم پڑ گیا تھا۔

''میں سمجھ سکتی ہوں مسٹر آذر! کہ آپ اور آپ کی وائف پر کیا گزر رہی ہوگی.....لیکن کچھ معاملات میں انسان بالکل بے اختیار ہوتا ہے .....میں اتنے سالوں سے یہ Orphan Home چلا رہی ہوں اور ایسا واقعہ پہلی بار ہوا ہے۔ بٹ اینی وے، ایسی صورتحال پر قابو پانے کے لیے ہم کچھ rules بنا رہے ہیں تا کہ آئندہ ایسی کوئی مشکل پیش نہ آئے'' مسز سلیم کا لہجہ ہلکی سی ندامت لیے ہوئے تھا۔

''آپ کو ایسا کرنا بھی چاہیے.....چلو رباب!....'' آذر اٹھ کھڑا ہوا تو رباب بھی خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''لیکن آذر صاحب! آپ کوئی اور .....'' ان دونوں کو یوں اٹھتا دیکھ کر وہ بھی کسی قدر بوکھلا کر کھڑی ہو گئیں۔

''پلیز مسز سلیم!.....ہمیں سوچنے کے لیے وقت درکار ہے.....'' آذر نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں مزید کچھ کہنے سے روک دیا اور رباب کو لیے وہاں سے چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

اس دن کے بعد سے رباب بالکل بجھ کر رہ گئی تھی۔ حالانکہ وہ کوشش کرتی تھی کہ آذر کے سامنے مسکراتی رہے لیکن اس کی آنکھیں اس کی کھوکھلی مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دے پاتی تھیں اور آذر اسے یوں اندر ہی اندر گھٹتا دیکھ کر سوائے اسے تسلیاں دینے کے اور کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔

وہ کچن میں رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھی۔آذر اسے چائے بنانے کا کہنے کچن میں آیا تو کچن کا منظر دیکھ کر ایک پل کے لیے تو وہ حیران رہ گیا۔رباب کے دوپٹے کے پلو میں آگ لگی ہوئی تھی اور وہ چولہے کے قریب کھڑی نجانے کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔آذر نے فوراً اس کا دوپٹا کھینچ کر زمین پر پھینک دیا۔دوپٹے کے کھچاؤ سے، گلے میں پڑنے والے کھنچاؤ نے اس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔

''کیا.....کیا ہوا.....'' اس نے کسی قدر چونک کر پہلے آذر اور پھر اپنے آگ میں جھلستے دوپٹے کو دیکھا۔

''یہ.....آگ.....''دوپٹے میں آگ لگی دیکھ کر وہ کانپ اٹھی۔

''کیا ہو گیا ہے رباب تمھیں؟.....کیوں اپنی جان کو روگ لگا رہی ہو؟.....اگر تمھیں کچھ ہو جاتا تو سوچا ہے میرا کیا ہوتا؟.....''اس کی حد درجہ بے فکری پر آذر نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا لیکن جب نظر اس کے خوف سے زرد پڑتے چہرے پر پڑی تو اس نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور اس کے بازوؤں کے حصار میں آتے ہی وہ سسک اٹھی۔

''آذر! بلیومی!.....میں ایسے جینا نہیں چاہتی.....میں تو کتنی کوشش کرتی ہوں کہ سب کچھ بھول جاؤں لیکن پتا نہیں کیوں بھول نہیں پاتی''

''اٹس اوکے.....میں ہوں نہ تمھارے ساتھ.....سب ٹھیک ہو جائے گا ڈونٹ وری.....'' آذر نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

''آذر! مجھے کچھ دنوں کے لیے یہاں سے کہیں دور لے چلو.....میں اس فرسٹریشن سے باہر آنا چاہتی ہوں.....تمھارے ساتھ جینا چاہتی ہوں''اس کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ صرف زندگی سے ہی نہیں بلکہ اپنے آپ سے بھی عاجز آ چکی ہے۔

''میری جان! جہاں کہو گی، ہم وہیں چلیں گے'' وہ فوراً ہی تیار ہو گیا کیونکہ اس وقت وہ جس ذہنی کشمکش سے گزر رہی تھی اس میں آب و ہوا کی تبدیلی اس پر بہت مثبت اثر ڈال سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

عید کی چھٹیوں کے ساتھ ہی آذر نے آفس سے ایک ہفتے کی مزید چھٹیاں بھی لے لی تھیں اور وہ رباب کو لے کر مری جا رہا تھا تا کہ اس کا دھیان بٹ جائے اور وہ فرسٹریشن سے باہر نکل آئے۔ انہی دنوں جب وہ مری جانے کی تیاریاں کر رہے تھے، آذر کی نظر سے ایک خبر گزری جس میں شمالی علاقوں میں زلزلہ آنے کے بعد وہاں بچوں کی ایک بڑی تعداد کے یتیم ہو جانے کے بارے میں پورا فیچر دیا گیا تھا۔ حکومت ان بچوں کو ایدھی سینٹر، انصار برنی ٹرسٹ اور ایسے ہی مختلف اداروں کے حوالے کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ یہ فیچر دیکھ کر آذر کو اچانک ایک خیال سوجھا اور اس نے اس پر فوراً ہی عمل بھی کر ڈالا۔ اس نے مری جانے کی بجائے مظفر آباد جانے کا پروگرام بنا لیا۔ رباب کو اس نے پروگرام کی تبدیلی کا تو بتا دیا تھا لیکن اس کی وجہ نہیں بتائی تھی کیونکہ پہلے وہ وہاں جا کر وہاں کے حالات جاننا چاہتا تھا تا کہ اس کے مطابق فیصلہ کر سکے۔ رباب نے مری جانے کی بجائے مظفر آباد جانے پر کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا کیونکہ وہ تو بس اس شہر کے ہنگاموں سے کچھ دیر کے لیے دور جانا چاہتی تھی۔

آذر نے بس میں سفر کرنے کی بجائے اسلام آباد سے جیپ کرائے پر لے لی جب وہ مظفر آباد پہنچے تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔ وہاں کی حالت دیکھ کر تو رباب دنگ رہ گئی۔ گو کہ زلزلے سے ہونے والی تباہی کے بارے میں وہ ٹی وی پر کافی کچھ سن اور دیکھ چکی تھی لیکن اب وہی سب اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جو کچھ دیکھا اور سنا تھا، وہ تو شاید اصل تباہی کا ایک حصہ بھی نہیں تھا۔ حالانکہ اب تو زلزلے کو آئے ایک مہینہ گزر

چکا تھا لیکن وہاں کی صورتحال انتہائی خستہ تھی۔ لوگوں کو سر چھپانے کے لیے خیمے تو دے دیئے گئے تھے اور کسی حد تک ان کے کھانے پینے اور زخمیوں کی امداد کا کام بھی ہو رہا تھا لیکن ان لوگوں کے دکھ کے سامنے وہ سب بہت کم لگ رہا تھا۔ ہر اک چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ آنکھوں میں آنسو تو جیسے منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔ ہونٹ اتنی سختی سے ایک دوسرے میں پیوست تھے کہ جیسے کبھی مسکرائے ہی نہ ہوں۔ ہر چہرے پر بس ایک ہی دکھ رقم تھا اور رباب ہکا بکا کھڑی ان لوگوں کو دیکھ رہی تھی جو اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود جی رہے تھے یا جینے پر مجبور کر دیئے گئے تھے۔

جہاں وہ کھڑی تھی اس کے قریب ہی ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھی ایک بچی بڑی ہی عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے گالوں پر آنسوؤں کی بہت گہری لکیریں تھیں۔ وہ آہستہ روی سے چلتی ہوئی اس بچی کے پاس آ گئی اور اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ رباب کے ایک ہاتھ میں جوس کا ڈبہ تھا جس میں سے بمشکل اس نے دو گھونٹ ہی لیے تھے۔ اس نے پیار سے اس کے گالوں کو چھوا۔ بچی نے ایک نظر اسے اور پھر اس کے ہاتھ میں موجود جوس کے ڈبے کو دیکھا اور دوسرے ہی پل وہ جوس کا ڈبہ اس کے ہاتھ سے چھین کر بھاگ گئی۔ رباب نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن اس کا دل تڑپ اٹھا اور آنکھیں بھر آئیں۔ بچی سامنے موجود بہت سے خیموں میں سے کسی خیمے میں جا کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ وہ بچی کی بے بسی پر آنسو بہاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کیا ہوا رباب!.....'' آذر نے آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں.....چلیں.....'' اس نے جلدی سے انگلی کی پوروں سے آنکھوں کے بھیگے گوشے پونچھ ڈالے۔

''مجھ سے تم اپنا آپ نہیں چھپا سکتیں'' آذر نے اسے کندھوں سے تھام کر اپنی طرف گھما ڈالا۔

☆ ☆ ☆

آذر نے مظفر آباد سے تقریباً دو گھنٹے کی ڈرائیو پر ایک پرانا سا کاٹیج ایک ہفتے کے لیے رینٹ پر لے لیا تھا کیونکہ یہاں کے جو حالات تھے ایسے میں رباب کا ان کے درمیان رہنا اسے مزید فرسٹریٹ کر سکتا تھا۔ ویسے بھی وہ اتنی حساس تھی کہ یہ سب برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ آذر نے رباب کو اصلی بات نہیں بتائی تھی کہ وہ بچے کیلئے یہاں آئے ہوئے تھے مگر رباب کو کچھ شک سا تھا کہ آذر یہ ساری مشکل اُس کیلئے ہی اُٹھا رہا ہے۔

پچھلے پانچ دنوں سے وہ روزانہ یہاں آ رہے تھے لیکن اب تک کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ یہاں سے بچے کی اڈاپٹیشن اتنا بڑا مسئلہ بن جائے گی ،اس کا آذر کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا۔

بلکہ وہ تو یہاں آیا ہی اس لیے تھا کہ نہ صرف بچے کی کسٹڈی انھیں آرام سے مل جائے گی بلکہ بعد میں کوئی پرابلم ہونے کے چانسز بھی بہت کم تھے لیکن یہاں سب کچھ اس کی سوچ کے برعکس ہو رہا تھا۔ ایک دو سالہ بچی انھیں بے حد پسند آئی تھی اور اس زلزلے میں اس بچی کے قریبی رشتے داروں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ گھر کے تمام افراد ختم ہو گئے تھے، صرف یہ بچی ہی کراماتی طور پر بچ گئی تھی۔ آذر نے فوری طور پر اس بچی کی کسٹڈی حاصل کرنے کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی کیونکہ وہ بچی کو لیکر فوراً واپس چلے جانا چاہتا تھا لیکن یہاں ایسے تمام یتیم اور بے سہارا بچوں کو حکومت کے نمائندوں کی نگرانی میں رکھا گیا تھا اور وہ لوگ فی الحال کسی بھی بچے کی کسٹڈی دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ تمام بچوں کو مختلف مُوقر اداروں کے سپرد کرنا چاہ رہے تھے تاکہ جو چاہے انھیں وہاں سے اڈاپٹ کر

سکے۔فی الحال وہ بغیر کسی لیگل ڈاکومینٹیشن کے کسی بھی بچے کی کسٹڈی نہیں دینا چاہ رہے تھے لیکن آذر اس بار رباب کو خالی ہاتھ واپس نہیں لے جانا چاہتا تھا۔اس نے اپنے تمام sources استعمال کرتے ہوئے آخرکار چھ دنوں کی انتھک کوششوں سے اسی ننھی بچی کی کسٹڈی حاصل کر لی اور اب وہ بچی کو لیے مظفر آباد سے واپس لوٹ رہے تھے۔آذر جیپ ڈرائیو کر رہا تھا جبکہ رباب ساتھ بیٹھی محبت بھری نظروں سے اپنی گود میں سوئی ننھی منی سی گڑیا کو دیکھ رہی تھی۔آذر ڈرائیو کرتے ہوئے کبھی کبھار ایک نظر اس پر بھی ڈال لیتا تھا۔رباب کے ہونٹوں پر سجی مسکراہٹ اور چہرے پر پھیلا اطمینان اس کی روح تک کو سرشار کر رہا تھا۔آج کتنے دنوں بعد اس نے اسے یوں مسکراتے دیکھا تھا ورنہ تو وہ اس کے ہونٹوں پر ہنسی کھوجتے کھوجتے تھک چکا تھا۔

''آج مجھے میری رباب واپس مل گئی''اس نے اچانک کہا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''ایسا کیوں کہا تم نے؟''

''کیونکہ ایک ماں نے میری رباب کو مجھ سے چھین لیا تھا''اس نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی اور پھر نظریں سامنے سڑک پر جما دیں۔

''آئی ایم سوری آذر!.....مگر میں کیا کرتی؟''

اور وہ اپنی گود میں لیٹی ننھی سی بچی کو پیار سے دیکھنے لگی۔

آج رباب کا ادھورا پن ختم ہو گیا تھا۔

آج رباب مکمل ہو گئی تھی۔

آج مامتا کی تکمیل ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اسقاط

ستمبر کے اس مہینے میں پہاڑی علاقہ ہونے کے باوجود پشاور میں موسم کافی گرم تھا خصوصاً دوپہر میں دھوپ کی تمازت کھلے صحن میں بیٹھنے نہیں دیتی تھی لیکن آج صبح سے ہی موسم بہت خوشگوار تھا۔آسمان پر سرمئی اور سفید بادلوں کے ٹکڑے منڈلا رہے تھے۔سورج کی ہلکی ہلکی روشنی بھی موجود تھی لیکن بادلوں سے بھرے آسمان نے سورج کی تمازت کو ٹھنڈی روشنی میں بدل دیا تھا۔ہلکی ٹھنڈی ہوا بھی چل رہی تھی جو موسم کی تبدیلی کا پتا دے رہی تھی۔ خوشگوار موسم نے سب کو کمروں سے نکل کر پیچھے کھلے صحن میں آنے پر مجبور کر دیا۔

الماس بیگم بھی اپنی اون سلائیاں لیے باہر آئیں تو بی جان کو پہلے ہی صحن میں تخت پر براجمان پایا۔سامنے ہی گھر کی پرانی ملازمہ کی بیٹی کپڑے دھو رہی تھی۔ان کی تیز نظریں

کپڑے دھوتے ہوئے اس کا بغور جائزہ لے رہی تھیں اور ساتھ ساتھ زبان سے مشورے بھی جاری تھے۔ ملازمہ کی بیٹی بمشکل تیرہ چودہ سال کی تھی۔ بچپن ابھی پوری طرح اس سے رخصت نہیں ہوا تھا اس لیے وہ ان کی ڈانٹ اور مشوروں پر ناراض ہونے کی بجائے بس سر نیچا کیے ہنستی جا رہی تھی اور بی جان کو اس کی یہ ڈھٹائی کتنا سلگا رہی ہوگی اس کا اندازہ الماس بیگم آسانی سے لگا سکتی تھیں۔ وہ مسکراتی ہوئی ان کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

''کیا ہوا بی جان!....کس پر خفا ہو رہی ہیں؟'' الماس بیگم نے اون سلائیاں ہاتھوں میں سیٹ کرتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا لیکن چہرے پر اب بھی نرمی کا تاثر موجود تھا۔

''اور کون ہو سکتا ہے....ایک یہی کافی ہے میری جان جلانے کو.....'' انھوں نے کسی قدر زچ ہو کر کہا۔

''چھوڑیں بی جان! اسے۔ بچی ہے، آہستہ آہستہ سیکھ جائے گی'' انھوں نے مسکرا کر ٹالنے کے انداز میں کہا۔

''رہنے دو بس.....یہ کیا.....سائم آج کالج نہیں گیا'' کسی قدر برہمی سے کہتے کہتے اچانک ہی ان کی نظر برآمدے میں آتے سائم پر پڑی اور وہ اپنا غصہ بھول کر اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''نہیں.....ناراضی دکھا رہے ہیں صاحبزادے.....'' الماس بیگم نے برآمدے میں پلر سے ٹیک لگا کر کھڑے سائم کی طرف دیکھ کر کسی قدر افسردگی سے کہا تو ان کی نظروں میں کل کا واقعہ گھوم گیا۔

''سائم!.....ادھر آؤ.....'' انھوں نے آواز دی تو وہ جو جان بوجھ کر ان دونوں کو اب تک نظر انداز کیے ہوئے تھا بے دلی سے چلتا ان کے پاس آ گیا۔

''جی بی جان!.....'' اس کا لہجہ اب بھی خفگی لیے ہوئے تھا۔

''پہلے میرے پاس تو بیٹھ.....''انھوں نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھالیا۔

''ہاں اب بتا.....اپنی ماں سے ناراض کیوں ہے؟''انھوں نے اس کے کان پکڑ کر کھینچے۔

''میں کب ناراض ہوں''

''تو اور ناراضی کیسے ہوتی ہے.....نہ ٹھیک سے کھا رہے ہو، نہ بات کر رہے ہو اور آج کالج بھی نہیں گئے''الماس بیگم نے فوراً ہی کہا۔

''پھر میں کیا کروں.....آپ ہی بتائیں.....ایک چھوٹی سی خواہش کی تھی میں نے لیکن آپ نے فوراً ہی انکار کر دیا''اس نے شکایتی انداز میں کہا۔

''سائم! تمھاری یہ ناراضی بے جا ہے کیوں کہ اگر ہم مان بھی جائیں تب بھی تم اچھی طرح جانتے ہو کہ شاہ جی کبھی نہیں مانیں گے اور میں نہیں چاہتی کہ تم ان کے ساتھ کوئی بحث کرو اور وہ غصے میں آ کر.....''الماس بیگم نے کہتے کہتے لب بھینچ لیے۔

''افوہ امی!.....میں بابا جان کے ساتھ کوئی بحث نہیں کروں گا.....لیکن پہلے آپ مانیں تو.....پھر.....''اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی تو انھوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''تمھارا مطلب کہیں یہ تو نہیں کہ میں.....نہیں ہرگز نہیں.....'' وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا وہ فوراً ہی سمجھ گئی تھیں اس لیے قطعیت سے کہہ کر دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئیں۔

''بی جان! پلیز.....آپ سمجھائیں نا امی کو.....اگر آپ دونوں بات کریں گی تو بابا جان ضرور مان جائیں گے'' سائم نے امید بھری نظروں سے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''الماس! جب بچہ اتنا کہہ رہا ہے تو بات کر کے دیکھ۔ کیا خبر وہ مان ہی جائے'' بی جان سے اکلوتے پوتے کا اترا ہوا چہرہ دیکھا نہ گیا۔

''بی جان! آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ وہ اپنے اصولوں سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹتے پھر بھی .....'' الماس بیگم نے بیچارگی سے کہا لیکن پھر سائم کا اصرار دیکھ کر وہ بھی مان ہی گئیں۔

''اچھا ٹھیک ہے.....میں کروں گی بات.....'' انھوں نے جیسے ہی کہا سائم نے خوش ہو کر ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور ان کے ساتھ ساتھ بی جان بھی مسکرا اٹھیں۔

☆ ☆ ☆

سنگ مرمر کے کالے پتھروں سے بنا تین کنال کے رقبے پر پھیلا ہوا یہ گھر گو کہ کافی پرانا بنا ہوا تھا لیکن اس کی دیکھ بھال اتنے اچھے انداز میں کی جاتی تھی کہ اس پورے علاقے میں بنے تمام گھروں کی نسبت اپنی بناوٹ اور شان کے لحاظ سے یہ سب سے منفرد نظر آتا تھا۔ اس گھر کی شان اور زوار شاہ کے رعب و دبدبے کی دھاک پورے علاقے کے لوگوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اگر چہ زوار شاہ کوئی جدی پشتی رئیس نہیں تھے۔ وہ کم عمر ہی تھے کہ ان کے والد فوت ہو گئے۔ ورثے میں ملے ہوئے چند باغوں کو انھوں نے اپنی محنت سے کئی رقبوں پر پھیلا لیا تھا اور آج اپنے علاقے میں ان کی ٹکر کا کوئی نہ تھا۔ اتنی کم عمری سے ہی ذمہ داریاں سنبھالنے کی وجہ سے ان کے مزاج میں کسی قدر سختی کا عنصر غالب آ گیا تھا اور ان کے مزاج کی یہ سختی جہاں کبھی کبھی ان کے گھر والوں کے دلوں میں کوئی نہ کوئی کسک چھوڑ جاتی، وہیں دوسروں کو بھی اکثر چبھن کا احساس دے جاتی تھی لیکن یہ سختی اب ان کے مزاج کا ہی ایک حصہ تھی جسے اب ان سے الگ کرنا تقریباً ناممکن تھا۔

زوار شاہ کی گاڑی کے گھر میں داخل ہونے کی آواز سن کر سائم بی جان اور الماس بیگم کو

ان سے بات کرنے کی یاددہانی کروا تا لاؤنج سے ملحق اپنے کمرے میں چلا گیا اور الماس قہوہ لینے کچن میں چلی گئیں ۔کچن سے نکلیں تو ملازمہ قہوے کی پیالیاں ٹرے میں رکھے سر جھکائے ان کے پیچھے چل رہی تھی اور زوار شاہ لاؤنج میں اپنی ایزی چیئر پر نیم دراز آنکھیں موندے ہولے ہولے اپنی پیشانی کو سہلا رہے تھے جیسے کسی بہت گہری سوچ میں گم ہوں۔ ملازمہ خاموشی سے ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھ کر چلی گئی۔الماس بیگم نے ٹرے سے ایک کپ اٹھایا اور ان کے پاس جا کر کھڑی ہو گئیں۔

''شاہ جی!.....قہوہ.....''انھوں نے بہت آہستہ سے پکارا تھا لیکن وہ پھر بھی چونک اٹھے۔

'' ہوں.....'' زوار شاہ نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور کپ تھام لیا۔

''کیا بات ہے.....کچھ پریشان لگ رہے ہیں آپ''انھوں نے ایک کپ بی جان کو دیا اور دوسرا خود لیکر بیٹھ گئیں۔

''یہ دو کوڑی کے لوگ.....مجھ سے حق کی باتیں کرتے ہیں.....آج اگر نوکری سے نکال دوں تو سڑکوں پر بھیک مانگتے نظر آئیں گے''انھوں نے نخوت سے گردن اکڑا کر کہا اور الماس بیگم محض ایک گہرا سانس بھر کر رہ گئیں کہ ان کے غصے سے اچھی طرح واقف تھیں اور ویسے بھی اب انھیں حکمرانی کی عادت سی ہو گئی تھی۔اپنے سامنے وہ کسی کی چلنے نہیں دیتے تھے۔ان کے اس تکبرانہ انداز کی وجہ سے لوگ ان کی عزت تو کم ہی کرتے تھے لیکن ڈرتے زیادہ تھے اور اس ڈر کو ہی زوار شاہ اپنی عزت سمجھ کر اکڑے رہتے تھے۔

''نہ بیٹا!.....کسی غریب کی آہ نہیں لیتے.....''بی جان نے ان کے تیور دیکھ کر ڈرتے ہوئے کہا۔

''بی جان!.....یہ عورتوں کے وہم آپ اپنے پاس ہی رکھیں.....''انھوں نے کسی قدر

چڑ کر کہا۔

تھوڑی دیر لاؤنج کی فضا میں خاموشی چھائی رہی جسے بی جان کے اشارے پر الماس بیگم نے توڑا۔

''شاہ جی!.....وہ سائم کا کالج لڑکوں کو ایک ہفتے کے ٹور پر سوات لے جا رہے ہیں.....تو.....سائم بھی جانا چاہ رہا ہے'' آخری جملہ انہوں نے کسی قدر جھجکتے ہوئے بولا۔

''الماس بیگم!.....تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مجھے ایسی تفریح پسند نہیں.....پھر یہ بات پوچھنے کا مقصد.....'' زوار شاہ کے لہجے میں سختی کا عنصر نمایاں تھا۔الماس بیگم تو ان کا لہجہ سن کر ہی خاموش ہو گئیں لیکن بی جان سے رہا نہ گیا اور کہنے لگیں۔

''بیٹا!.....سائم کی اتنی خواہش ہے تو اس میں آخر ہرج ہی.....'' ان کے بات مکمل کرنے سے پہلے ہی انھوں نے قہوے کا کپ ٹیبل پر زور سے پٹخا اور غصے میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ہرج.....ہرج یہ ہے کہ میں اپنے اصولوں میں تبدیلی کا قائل نہیں اور نہ ان پر بحث کرنا ہی پسند کرتا ہوں....'' انھوں نے قطعیت سے کہا تو سائم جو کمرے میں موجود سب کچھ سن رہا تھا، اس نے غصے میں آ کر ادھ کھلے دروازے کو پوری قوت سے بند کر دیا۔اتنی زور سے دروازہ بند کیے جانے پر ان کا غصے میں آ جانا یقینی تھا۔

''الماس بیگم!.....دیکھ رہی ہیں اپنی تربیت کا نتیجہ.....'' انھوں نے ایک قہر بھری نظر ان پر ڈالی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے جبکہ الماس بیگم نے بے بسی سے بی جان کو دیکھا جو بیٹے کے انداز دیکھ کر خود بھی دل شکستہ نظر آ رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

بی جان عصر کی نماز پڑھ کر کمرے سے نکلیں تو الماس بیگم کو بے چینی کے عالم میں لاؤنج میں ٹہلتے پایا۔

''کیا ہوا الماس!.....تو اتنی پریشان کیوں لگ رہی ہے'' بی جان نے اپنا چشمہ آنکھوں پر لگاتے ہوئے بغور ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سائم ابھی تک کالج سے نہیں لوٹا.....'' وہ بار بار بے قراری سے لاؤنج کے بند دروازے کو دیکھ رہی تھیں۔

''اچھا.....تو فکر نہ کر وہ آجائے گا.....راستے میں کوئی دوست مل گیا ہوگا.....آتا ہی ہو گا.....'' پریشان تو وہ بھی ہوگئی تھیں لیکن الماس بیگم کی بے چینی دیکھ کر انھوں نے اپنی پریشانی ظاہر نہیں ہونے دی اور ہاتھ میں پکڑی تسبیح پر ان کے ہاتھ اچانک ہی تیزی سے چلنے لگے۔

''مجھے تو بڑی گھبراہٹ ہو رہی ہے'' انھوں نے اضطراری انداز میں اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسائے کہا۔

''تو فون کر کے دیکھ .....اس کے پاس وہ ہوگا نا.....کیا کہتے ہیں اسے .....'' انھوں نے ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کی کہ ہر بار ہی اس کا نام ان کے ذہن سے نکل جاتا تھا۔

''کیا تھا فون لیکن موبائل بند ہے اس کا..... پتا نہیں یہ لڑکا.....'' ابھی ان کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کی بائیک رکنے کی آواز سن کر وہ چونک اٹھیں۔اس سے پہلے کہ وہ باہر نکلتیں، لاؤنج کا دروازہ کھلا اور وہ بے دلی سے چلتا ہوا اندر داخل ہوا۔

''سائم!.....یہ وقت ہے تمھارے آنے کا.....کم از کم ایک فون ہی کر دیتے.....کچھ احساس ہے کہ میں کتنی پریشان ہو رہی تھی.....اور اگر تمھارے بابا.....'' اسے سامنے دیکھ کر ان کی پریشانی غصے میں بدل گئی تھی جس کا انھوں نے فوراً ہی اظہار بھی کر دیا۔

''اب کیا میرا دوستوں کے پاس کچھ دیر رکنا بھی بابا جان کے اصولوں کے خلاف ہے.....کسی دن آپ یہ مت کہہ دیجیے گا کہ میرا سانس لینا بھی ان کے اصولوں کے خلاف ہے....میرا ہنسنا، میرا بولنا .....'' وہ طنزیہ انداز میں ان کی طرف دیکھتا نجانے اور کیا کہنے جارہا تھا کہ الماس بیگم نے اسے بدتمیزی کی حدود میں داخل ہوتا دیکھ کر فوراً ہی ٹوک دیا۔

''بس سائم شاہ!.....بہت ہوگیا.....تمھاری بدتمیزی اور میری برداشت کی حد یہاں ختم ہو جاتی ہے.....'' انھوں نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا تو وہ زور سے پاؤں پٹختا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں جا کر اس نے زور سے دروازہ بند کیا تو الماس بیگم نے اس کا غصہ دیکھ کر سختی سے لب بھینچ لیے۔

''تمھیں اس کے ساتھ اتنی سختی سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی'' بی جان نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''آپ نے دیکھا نہیں کس طرح بات کر رہا تھا مجھ سے.....ان دونوں باپ بیٹوں کا غصہ کسی دن میری جان لیکر چھوڑے گا'' انھوں نے بے بسی سے لب کاٹتے ہوئے کہا۔

''اس میں قصور اس کا نہیں۔ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے کہ پابندیاں قید کی طرح لگتی ہیں.....زوار تو سمجھتا نہیں بس حکم چلانا جانتا ہے لیکن کم از کم تم تو اسے سمجھو.....تم بھی اگر زوار کا رویہ اپنا لوگی تو وہ بیچارا کہاں جائے گا'' بی جان نے کہا تو انھیں بھی احساس ہوگیا کہ وہ غصے میں اس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی سختی برت گئی ہیں۔

''میں دیکھتی ہوں اسے جا کر.....'' ان کی ممتا ایکدم امڈ آئی اور وہ اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں جبکہ بی جان مسکراتی ہوئی واپس اپنے کمرے میں چلی گئیں کیوں کہ انہیں یقین تھا کہ اب وہ پیار سے اس کے غصے کو قابو میں کر لیں گی۔

☆ ☆ ☆

حالات کافی حد تک معمول پر آ چکے تھے۔الماس بیگم نے آخر سائم کو منا ہی لیا تھا۔آج پہلا روزہ تھا اس لیے وہ خود کچن میں موجود رہ کر افطاری میں خاص اہتمام کروا رہی تھیں۔ سائم بھی انھیں ڈھونڈتا ہوا کچن میں چلا آیا۔

''امی! آپ یہاں ہیں اور میں کب سے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں'' اس نے کچن کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا۔

''کیوں اب کتنے پیسوں کی ضرورت پڑ گئی ہے''انھوں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا کیوں کہ جانتی تھیں کہ وہ مہینے کے شروع میں اکثر اپنی پاکٹ منی ختم ہونے کا رونا رو کر ان سے پیسے لیتا رہتا تھا۔شاہ جی تو اسے ہر مہینے کی دس تاریخ کو ایک لگی بندھی رقم دے کر دوبارہ مڑ کر پوچھتے بھی نہیں تھے لیکن وہ ان سے اور بی جان سے مختلف حیلے بہانوں سے پیسے لے لیتا تھا۔

''پندرہ ہزار .....''اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا اور ان کے چہرے کی مسکراہٹ ایکدم غائب ہو گئی۔

''سائم!.....تم ہوش میں تو ہو.....''انھوں نے اتنی بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا جیسے پورا یقین ہو کہ وہ ابھی ہنس پڑے گا لیکن اس کے چہرے کی سنجیدگی برقرار رہی۔

''امی!.....میں واقعی سنجیدہ ہوں .....مجھے پندرہ ہزار کی .....''اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑیں۔

''تم سنجیدہ نہیں بلکہ تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے'' وہ غصے میں کہتی کچن سے نکل کر لاؤنج میں آ گئیں جہاں بی جان ہاتھ میں تسبیح لیے اپنے وظیفے میں مشغول تھیں۔سائم بھی ان کے پیچھے چلا آیا۔

''امی! آپ تو ایسے ری ایکٹ کر رہی ہیں جیسے میں نے پندرہ ہزار نہیں بلکہ پندرہ لاکھ

مانگ لیے ہوں.....اور بے فکر رہیں، یہ پیسے میں میوزک سسٹم خریدنے کے لیے مانگ رہا ہوں شائد اسی طرح زندگی آسان ہو.....''اس نے منہ بناتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔

''تو بیٹا جی! پھر اپنے بابا جان سے مانگو....'' انھوں نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔

''سوچ لیں.....پھر جب میں بابا جان کے ساتھ بحث کروں گا تو پھر آپ ہی.....'' اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی اور وہ محض لب بھینچ کر رہ گئیں۔

''یہ ماں بیٹے میں بحث کیوں ہو رہی ہے آج؟'' بی جان نے اپنا وظیفہ ختم کر کے ان دونوں کو اپنی اپنی جگہ سوچوں میں گھرے دیکھ کر پوچھا

''یہ اپنے لاڈلے سے ہی پوچھیے.....ہر بار کوئی نہ کوئی نئی مشکل کھڑی کر دیتا ہے میرے لیے.....''ان کے لہجے سے پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔

''کیوں سائم!'' وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''بی جان!.....آپ ہی سمجھائیے نا امی کو.....میں کوئی ایسی بے جا ضد بھی نہیں کر رہا جو امی اتنی سختی سے پیش آ رہی ہیں.....''وہ بی جان کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور ان کے گھٹنے دباتے ہوئے آنکھوں کے ذریعے اپنی سفارش کرنے کی منت کرنے لگا۔

''الماس!.....اگر اسے واقعی ضرورت ہے تو دے دے اسے.....''ان سے اس کی آنکھوں کی اداسی دیکھی نہ گئی۔

''بی جان!.....آپ بھی کمال کرتی ہیں.....میرے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے.....''انھوں نے کسی قدر حیرانی سے کہتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

''اچھا ٹھیک ہے رہنے دے تو.....میں دیتی ہوں تجھے.....'' انھوں نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو سائم بھی اٹھ گیا۔

''آپ.....لیکن.....'' بی جان کو یوں اٹھتا دیکھ کر ان کی حیرت قابل دید تھی۔

''تو جا اپنا کام کر.....میرے پاس کچھ پیسے جمع ہیں.....میں نے کیا کرنا ہے ان کا۔ اچھا ہے اس کے کام آجائیں گے'' وہ الماس کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے سائم کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ سائم کو مسکراتے ہوئے ان کے پیچھے جاتے دیکھ کر وہ ایک گہرا سانس بھر کر کندھے اچکاتی کچن کی طرف چلی گئیں۔

☆ ☆ ☆

سائم اگلے دن شام کو ہی میوزک سسٹم خرید لایا تھا۔

اس وقت وہ اپنے دو دوستوں کے ساتھ کمرے میں موجود تھا اور وہ سب میوزک سن رہے تھے۔ زوار شاہ ابھی تک گھر واپس نہیں لوٹے تھے۔ عصر کی اذان ہونے والی تھی اور اب وہ کسی بھی وقت گھر واپس آسکتے تھے۔ سائم کے کمرے سے ہلکی ہلکی میوزک کی آواز باہر آرہی تھی۔ الماس بیگم دو تین بار کمرے میں جا کر اسے فی الحال موسیقی بند کر دینے کا کہہ چکی تھیں لیکن ہر بار وہ انھیں کچھ نہ کچھ کہہ کر ٹالتا جا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے اپنے کمرے میں گئیں اور اسی وقت زوار شاہ کی گاڑی گھر کے اندر داخل ہوئی۔ الماس بیگم کو اپنے کمرے میں ہونے کی وجہ سے ان کی آمد کا پتا ہی نہیں چلا اور سائم کو تو کمرے میں میوزک گونجنے کی وجہ سے گاڑی کی آواز ہی نہیں آئی تھی۔

زوار شاہ نے جیسے ہی لاؤنج میں قدم رکھا ان کے حساس کانوں نے میوزک کی نامانوس آواز فوراً ہی محسوس کر لی۔ اس بے ہنگم آواز کی موجودگی انہیں اپنے گھر میں قطعاً برداشت نہیں تھی، اس لیے ان کا غصہ اپنے عروج پر پہنچ گیا اور وہ غصے میں لال بھبھوکا چہرہ لیے سائم کے کمرے میں جا پہنچے۔ ایک زوردار آواز کے ساتھ انھوں نے دھکیل کر دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر سائم اور اس کے دوست جو پوری طرح میوزک سننے میں مگن تھے

، چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے اور دروازے میں ایستادہ زوار شاہ کو غصے سے اپنی طرف دیکھتا پا کر ان تینوں نے بے اختیار اپنے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری تھی۔

زوار شاہ کے خوف نے چند لمحوں کے لیے تو ان کی زبانیں بند کر دیں۔ پھر سب سے پہلے ہمت کر کے سائم ہی بولا'' آئی ایم سوری بابا جان!.....ہم بس آواز بند ہی کرنے والے تھے''

سائم کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس وقتی ڈر کے احساس سے باہر آ چکا ہے اور اب وہ پورے اعتماد کے ساتھ ان کی طرف دیکھتے ہوئے بات کر رہا تھا اور شاید اس کا یہی اعتماد زوار شاہ کی حاکمانہ طبیعت پر گراں گزرا تھا۔

''کس کی اجازت سے تم نے اس خرافات کو میرے گھر میں لانے کی ہمت کی'' انھوں نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بابا جان!....جدیدیت کو آپ خرافات کا نام نہیں دے سکتے اور پھر یہ تو آجکل کی ضرورت ہے'' اس نے نرمی سے انھیں قائل کرنا چاہا لیکن اس کا ٹھوس انداز انھیں ایک آنکھ نہ بھایا۔

''تمھاری اتنی مجال کہ زوار شاہ سے اس لہجے میں بات کرو'' انھوں نے غصے سے پھنکارتے ہوئے لہجے میں کہا اور آگے بڑھ کر سارے وائرز کو بے دردی سے کھینچا۔ اس سے پہلے کہ سائم ان کی حرکت کو سمجھ پاتا، انھوں نے باکس ہی کو اپنے ہاتھوں میں اٹھایا اور کھلی کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ ایک زوردار چھناکے کی آواز آئی اور سائم نے بے بسی سے لب بھینچ لیے۔

زوار شاہ نے بڑے تفاخر سے اس کی بے بسی کو دیکھا تھا۔

''اپنے ان آوارہ دوستوں کو چلتا کرو اور اس کاٹھ کباڑ کو فوری طور پر میرے گھر سے

باہر پھینک کر مجھ سے ملو'' انھوں نے گردن اکڑا کر کہا اور تکبرانہ انداز میں چلتے ہوئے اس کے کمرے سے نکل گئے۔

ان کے کمرے سے نکلتے ہی اس کے دونوں دوست بھی اس پر ایک ترس بھری نظر ڈال کر چلے گئے اور یوں وہ دوستوں کے سامنے اپنی تذلیل کے احساس سے غصے میں تن فن کرتا سیدھا بی جان کے کمرے میں جا پہنچا۔

''بی جان! جانتی ہیں آپ آج بابا جان نے کیا کیا؟.....'' ان کے کمرے کا دروازہ کھولتے ہی اس نے غصے سے بولنا شروع کر دیا لیکن نظر جیسے ہی بیڈ پر نیم دراز بی جان کے پاس بیٹھے زوار شاہ پر پڑی تو اس کی زبان کو ایکدم بریک لگ گئی اور اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے لیکن اس کے چہرے پر برہمی کے آثار ہنوز برقرار تھے۔

''برخوردار!.....زوار شاہ کے فیصلوں کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت آج تک کسی نے نہیں کی تو پھر تم میری اولاد ہو کر.....'' وہ درشتگی سے کہتے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے لہجے میں اتنی سختی اور بے یقینی تھی کہ جیسے سائم سے ایسی کسی بات کی انھیں امید ہی نہ ہو۔

''فیصلے اگر غلط ہوں تو ان کے خلاف آواز اٹھانا غلط نہیں'' اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا جس پر زوار شاہ کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

''سائم شاہ!''

'' بابا جان! گستاخی معاف .....لیکن غلط کو غلط کہنا کوئی بری بات نہیں'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''لیکن میرے گھر میں ایسے لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں'' انھوں نے اپنا رعب قائم رکھنے کے لیے فوراً ہی اسے سزا بھی سنا دی۔

''جیسے آپ کا حکم.....میں چلا جاتا ہوں'' وہ کہہ کر جیسے ہی کمرے سے نکلنے لگا، بی جان

کا ضبط بھی جواب دے گیا اور کہنے لگیں۔

''کیا ہو گیا ہے تجھے جوان بیٹے کو گھر سے نکلنے کو کہہ رہا ہے.....بڑوں کا فرض ہوتا ہے کہ بچہ اگر غلطی کرے تو اسے پیار سے سمجھائیں.....نہ کہ یوں گھر سے نکال دیں''

''میں جو کر رہا ہوں اچھی طرح جانتا ہوں.....چار دن باہر رہے گا تو صاحبزادے کی عقل ٹھکانے آ جائے گی'' وہ تکبرانہ انداز میں کہتے کمرے سے نکل گئے۔

''الماس! .....الماس! ذرا دیکھ سائم کو .....'' وہ بھی پریشان حال آوازیں دیتی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☆ ☆ ☆

الماس بیگم کا پیار بھرا غصہ اور بی جان کی ہزار منتوں اور محبتوں کے باوجود سائم گھر چھوڑ کر چلا گیا۔اس کے جانے کے بعد گھر میں جیسے ایکدم سناٹا سا چھا گیا تھا۔الماس بیگم اور بی جان کی آنکھوں میں آنسو آ کر ٹھہر سے گئے لیکن زوار شاہ پر کوئی اثر نہ ہوا بس اس کے جانے کا سن کر ایک پل کے لیے ان کے چہرے پر بے یقینی کا تاثر ابھرا لیکن پھر وہی ازلی درشتگی نمایاں ہو گئی۔بی جان اور الماس بیگم کے لیے سائم کا گھر چھوڑ کر چلے جانا کسی صدمے سے کم نہیں تھا۔الماس بیگم نے سائم کا پتا کرنے کے لیے ان تمام ممکنہ جگہوں پر فون کر ڈالے تھے، جہاں انھیں اس کی موجودگی کا ذرا سا بھی شبہ تھا اور پھر بالاکوٹ فون کرنے پر پتا چلا کہ وہ وہاں اپنے ماموں کے پاس ہے تو ان کے دل کو بھی قرار آ گیا۔دو دن ہو گئے تھے، اسے گھر چھوڑ کر گئے ہوئے اور الماس بیگم اس سے ملنے، اسے دیکھنے کے لیے بے چین ہو رہی تھیں۔آخر اپنی ممتا سے مجبور ہو کر بھائی سے ملنے کا بہانہ بناتے ہوئے بالاکوٹ جانے کے لیے زوار شاہ سے اجازت طلب کی تو انھوں نے صاف انکار کر دیا کیوں کہ انھیں بھی سائم کی وہاں موجودگی کی اطلاع مل چکی تھی اور ان کے خیال میں معافی

مانگنے کی بجائے گھر چھوڑ کر چلے جانے کی اسے اتنی سزا تو ملنی چاہیے تھی کہ کچھ دن وہ گھر والوں سے دور رہے۔ الماس بیگم ان کا صاف انکار سن کر دل مسوس کر رہ گئیں لیکن بحث کرنے یا اپنی بات منوانے کی انھیں ہمت نہیں ہوئی۔

پچھلے دو تین دنوں سے وہ اسے روزانہ فون کر کے گھر واپس آنے کے لیے سمجھا رہی تھیں لیکن وہ بھی زوار شاہ ہی کی طرح ضدی تھا۔ اس نے بھی ضد پکڑ لی تھی کہ جب تک وہ خود نہیں بلائیں گے، نہیں آؤنگا جبکہ زوار شاہ کی فطرت سے وہ اچھی طرح واقف تھیں کہ پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ سکتا تھا لیکن زوار شاہ اپنے فیصلوں سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹ سکتے تھے۔ اسی لیے روز بروز ان کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ آج ان کا ارادہ بھائی بھابھی سے بھی بات کرنے کا تھا کہ وہ اسے گھر واپس آنے پر مجبور کریں۔ سحری کے بعد وہ زیادہ دیر سونے کی عادی نہیں تھیں لیکن سائم چھٹی کے دن بہت دیر تک سوتا تھا اس لیے انھوں نے خود کو اتنی جلدی فون کرنے سے بڑی مشکل سے روکا اور اپنے آپ کو گھر کے دوسرے کاموں میں مصروف کر لیا۔

زوار شاہ رمضان کی وجہ سے نو بجے تک اپنے کمرے سے باہر آتے تھے۔ ابھی نو بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے کہ زمین زور سے تھرتھرا اٹھی اور اس تھرتھراہٹ میں باقاعدہ ایک گونج بھی شامل تھی۔ الماس بیگم اس وقت کچن کے دروازے کے پاس موجود تھیں جب زلزلے کے اس شدید جھٹکے نے انھیں بے اختیار دروازہ تھامنے پر مجبور کر دیا اور پھر وہ دروازے کا سہارا لیتی پاس ہی موجود چوکی پر بیٹھ گئیں۔ کچھ دیر بعد جب زلزلے کے یہ جھٹکے تھمے تو فوراً کچن سے نکل کر وہ لاؤنج میں آ گئیں جہاں زوار شاہ ٹی وی پر نیوز چینل لگا رہے تھے۔ اسی وقت حواس باختہ بی جان بھی اپنے کمرے سے نکل کر باہر آ گئیں۔

''الماس! یہ ....'' گھبراہٹ میں ان کے منہ سے الفاظ ہی نہیں نکل رہے

تھے۔''بی جان! آپ یہاں بیٹھیے .....سب ٹھیک ہے اب .....'' الماس بیگم نے ان کے کپکپاتے وجود کو تھاما اور صوفے پر بٹھا دیا اور خود بھی وہیں بیٹھ کر ٹی وی سکرین پر نظریں جما دیں۔

مظفر آباد اور شمالی علاقوں میں زلزلے کی حشر سامانیاں دیکھ کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور وہ بے اختیار جھرجھری لے کر رہ گئیں لیکن جب بالاکوٹ کی تباہی کے بارے میں نیوز رپورٹر نے بتایا تو ان کے ساتھ ساتھ زوار شاہ بھی چونک اٹھے اور بے اختیار ہی دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اگر الماس بیگم کی آنکھوں میں خوف کے سائے لرزاں تھے تو زوار شاہ کے چہرے پر بھی پریشانی رقم تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں، زوار شاہ اٹھے اور فون سٹینڈ کی طرف بڑھ گئے لیکن کئی بار ٹرائی کرنے کے بعد بھی جب فون نہیں ملا تو انھوں نے زچ ہو کر ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ اسی وقت ان کے کانوں میں بی جان کی گھبرائی ہوئی آواز پہنچی۔

''الماس!.....الماس! کیا ہوا.....'' وہ آہستہ آہستہ انہیں ہلا رہی تھیں جو اچانک ہی نڈھال ہو کر صوفے پر ایک طرف لڑھک گئی تھیں۔

''کیا ہوا.....'' زوار شاہ فوراً ہی ان کے پاس آئے۔

''پتا نہیں.....ٹی وی دیکھتے دیکھتے اچانک ہی بے ہوش ہو گئی'' بی جان نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا اب وہ آہستہ آہستہ ان کی ہتھیلیاں مسل رہی تھیں۔

زوار شاہ نے ایک نظر ٹی وی کی طرف دیکھا اور بے اختیار ایک گہرا سانس بھر کر رہ گئے کیوں کہ بالاکوٹ کا جو منظر ٹی وی پر دکھایا جا رہا تھا اس کے مطابق تو پورا شہر ہی ختم ہو چکا تھا اور ظاہر ہے یہ نظارہ برداشت کر پانا کم از کم ایک ماں کے لیے تو بہت ہی مشکل تھا، وہ بھی اس صورت میں کہ جب اس کا اکلوتا بیٹا بھی اسی جگہ پر موجود ہو۔

''میں ڈاکٹر بلاتا ہوں'' وہ دوبارہ فون سٹینڈ کی طرف بڑھ گئے لیکن ان کے لب سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔

''لیکن کچھ مجھے بھی تو بتاؤ کہ ہوا کیا ہے.....ٹی وی میں ایسا کیا دیکھ لیا اس نے.....'' بی جان نے انھیں یوں بغیر کچھ بتائے جاتے دیکھ کر کہا لیکن انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا بس خاموشی سے نمبر ڈائل کرنے لگے۔

''ایک تو اس گھر میں سب اپنی اپنی مرضی کے مالک ہیں.....بیٹا ہے تو وہ اکڑ کر بیٹھا ہے، باپ کو اپنی ضد پیاری ہے.....ہمارے بارے میں کوئی نہیں سوچتا.....''

وہ بڑبڑاتے ہوئے دوبارہ الماس کی طرف متوجہ ہو گئیں اور بی جان کے لفظوں اور ان حالات نے انھیں پہلی بار احساس ندامت سے دوچار کر دیا۔

☆ ☆ ☆

زلزلے نے ان شہروں کا مواصلاتی نظام بھی درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا اس لیے کسی بھی قسم کا رابطہ ممکن نہیں رہا تھا۔ زوار شاہ، الماس بیگم اور بی جان کو تسلیاں دیتے خود وہاں پہنچے تو پتا چلا کہ بالاکوٹ جانے کے سب ہی راستے بند ہیں۔ نیچے تو امدادی کارروائی شروع ہو چکی تھی لیکن راستے بند ہونے کی وجہ سے اوپر ابھی تک امداد نہیں پہنچائی جا سکی تھی۔ زلزلہ جو آثار چھوڑ کر گیا تھا وہ دیکھ کر تو زوار شاہ جیسے مضبوط انسان کا دل بھی کانپ اٹھا تھا۔ نیچے وادی کے حالات دیکھ کر اوپر گزرنے والی قیامت کا اندازہ لگانا ان کے لیے زیادہ مشکل نہیں رہا تھا اور اسی وجہ سے اب انھیں سائم کی زیادہ فکر ہو رہی تھی لیکن اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ سائم کے لیے کچھ نہیں کر پا رہے تھے یا شاید قسمت انھیں کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھی۔ وہ پہلی بار خود کو بے بس محسوس کر رہے تھے یا کر دیئے گئے تھے۔

جس انسان نے کبھی جھکنا نہیں سیکھا تھا بلکہ ہمیشہ دوسروں کو اپنے آگے جھکایا تھا۔ آج

وہی تقدیر کی ستم ظریفی پر سر جھکائے کھڑا تھا۔

اوپر تک جانے کے سبھی راستے یا تو مکمل طور پر تباہ ہو چکے تھے یا پھر جگہ جگہ سے اس حد تک ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے کہ ان پر سفر کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ دو دن کی مسلسل کوششوں کے بعد وہ سفر کے قابل ہو سکے کہ تیسرے دن زوادشاہ اوپر پہنچ سکیں لیکن جب تک وہ وہاں پہنچے بہت دیر ہو چکی تھی۔ سائم ہمیشہ کے لیے ان سے جدا ہو چکا تھا۔ وہ گھر جو مکینوں کے لیے سائبان کی حیثیت رکھتا ہے، وہی آج ان کی قبر بن گیا تھا۔ گھر کا ایک فرد بھی زندہ نہیں بچا تھا۔

امدادی کارکنوں کی مدد سے انھوں نے لاشیں نکلوائیں اور پھر ان سب کے کفن دفن کا بھی انتظام کر دیا یہاں تک کہ انھیں سائم کو بھی وہیں دفن کرنا پڑا کیوں کہ لاش وہاں سے لے کر آنا تقریباً ناممکن تھا۔ وہ سائم جو گھر چھوڑ گیا تھا، آج دنیا بھی چھوڑ چکا تھا۔ شاید وہ واپس آ جاتا اگر.....

زوار شاہ ایک ہارے ہوئے باپ کی طرح واپس لوٹے تھے، کندھے جھکے ہوئے، ڈھلکی ہوئی گردن، شکستہ قدم جو بمشکل جسم کا بوجھ اٹھا پا رہے تھے۔ بی جان تو ان کی حالت دیکھ کر ہی سمجھ گئیں کہ وہ کیا کھو کر آ رہے ہیں لیکن الماس بیگم سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی اس حقیقت کو مان لینے پر تیار نہیں تھیں کہ سائم ان سے جدا ہو چکا ہے۔

''شاہ جی!.....سائم کہاں ہے؟.....آپ اکیلے کیوں آئے ہیں.....اسے ساتھ کیوں نہیں لائے؟.....'' ان کے لاؤنج میں داخل ہوتے ہی الماس بیگم ان کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔

''سائم.....نہیں رہا.....'' الفاظ ان کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے تھے۔

''نہیں.....آپ جھوٹ بول رہے ہیں.....مجھے میرا بیٹا لا کر دیں.....آپ نے

ہی اسے نکالا تھا.....آپ نے ہی اسے گھر چھوڑنے کیلئے کہا تھا.....اب آپ کو ہی اسے واپس لانا ہوگا''

الماس بیگم نے ان کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا اور انھوں نے سختی سے لب بھینچ لیے جبکہ بی جان کی بوڑھی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں وہ خود میں اتنی ہمت بھی نہیں پا رہی تھیں کہ الماس بیگم کو تسلی دے سکیں۔

''شاہ جی! آپ بولتے کیوں نہیں .....کہاں ہے میرا بیٹا؟.....'' الماس بیگم نے اب بھی ان کا گریبان پکڑا ہوا تھا اور اس بار ان کے لہجے میں پہلے سے بھی زیادہ سختی تھی لیکن زوار شاہ کچھ نہیں بولے۔ بس آہستہ سے اپنا گریبان ان سے چھڑایا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے لیکن الماس بیگم کی حالت انھیں احساس جرم سے دوچار کر گئی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے انھوں نے خود کو کمرے میں قید کر لیا لیکن الماس بیگم کی چیخیں، آہ وزاریاں سب ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں اور وہ خود کو احساس جرم کی اتھاہ گہرائیوں میں گرتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

قسمت.....تقدیر.....ان سب کو انھوں نے کبھی اہمیت نہیں دی تھی۔ انھیں سب سے زیادہ خود پر.....اپنے فیصلوں پر بھروسا تھا۔ انھیں، جھکنا نہیں جھکانا آتا تھا، اپنے فیصلوں کو منوانا پسند تھا لیکن تقدیر کے ایک ہی وار نے ان کا سارا غرور خاک میں ملا دیا تھا۔

ہمیشہ گردن اکڑا کے چلنے والا زوار شاہ آج عاجزی سے سر جھکا کر چلنا سیکھ گیا تھا۔ جو آنکھیں ہمیشہ قہر برساتی تھیں ان میں نرمی کے تاثر کے ساتھ ساتھ نمی بھی ٹھہر سی گئی تھی، چال میں غرور کی بجائے شکستگی آ گئی تھی۔ آج زوار شاہ کو اپنے پاس سے گزرتے دیکھ کر لوگ ڈرتے نہیں تھے بلکہ کچھ حیرت سے، کچھ ترس سے اور کچھ رشک سے دیکھتے تھے کیوں کہ اب

زوار شاہ صرف ایک باپ تھے۔ یہ اور بات ہے کہ جب تک انھیں احساس ہوا، تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ اپنا سب سے قیمتی رشتہ کھو چکے تھے لیکن اس رشتے کے کھونے کے بعد ہی وہ زندگی کے صحیح معنی سمجھ پائے تھے اور اب وہ اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنے کے لیے پوری تندہی سے زلزلے سے متاثرہ علاقوں کی امدادی کارروائیوں میں مالی معاونت میں مشغول ہو گئے۔ شاید اس طرح وہ اس احساس جرم کو کسی حد تک کم کر پائیں جو سائم کی موت نے انھیں دیا تھا حالانکہ یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں لیکن پھر بھی کہیں نہ کہیں سائم کی اس ناگہانی موت میں وہ خود کو قصوروار مانتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

آئو زندگی بچائیں

کمرا مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ خاموشی اتنی گہری تھی کہ کسی ذی نفس کی موجودگی کا احساس تک نہیں ہو رہا تھا۔ بس ایک پروجیکٹر چلنے کی آواز اس خاموشی میں ایک تلاطم برپا کر رہی تھی اور سفید پردے پر ایک کے بعد ایک بدلتی ہولناک تباہی کی تصویریں اس اندھیرے کمرے کو کچھ اور پراسرار بنا رہی تھیں۔ اچانک تصویریں چلنی بند ہو گئیں اور سفید روشن پردے پر سرخ رنگ سے انگریزی اور اردو میں لکھا سلوگن جگمگانے لگا۔

"LET'S SAVE LIFE"

''آؤ زندگی بچائیں''

چند سیکنڈز کے لیے سلوگن پردے پر نظر آیا۔ پھر ایکدم ہی کمرے کی لائٹس جل

اٹھیں اور پورا کمرا روشنی میں نہا گیا۔ روشنی ہوتے ہی کمرے میں موجود افراد نے بے اختیار زور سے پلکیں جھپکیں کیونکہ اتنی دیر سے تاریکی میں رہنے کی وجہ سے بہت زیادہ روشنی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ ایسا صرف چند لمحوں کے لیے ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سب نارمل ہو چکے تھے لیکن اس فلم کو دیکھنے کے بعد ان سب کے چہروں پر گہرے تفکر کی پرچھائیاں نظر آ رہی تھیں۔ سب اپنی اپنی جگہ سوچوں میں گم تھے۔

آخر اس خاموشی کو وجاہت حسن نے توڑا ''ابھی ابھی آپ صاحبان نے جو تصویریں دیکھیں، وہ آٹھ اکتوبر کے زلزلے سے ہونے والی تباہی کی تھیں..... زلزلہ تو محض چند منٹ کا تھا لیکن اس کے نشانات شاید سالوں ختم نہ ہو پائیں..... آج کی اس میٹنگ میں ہمیں ایسا لائحہ عمل طے کرنا ہے جس سے فوری فنڈز حاصل ہو سکیں تاکہ زلزلہ زدگان کی بحالی کے لیے موثر کارروائی کی جا سکے..... اس سے پہلے کہ آپ سب اپنی اپنی تجاویز پیش کریں میں آپ سب کو کسی سے ملوانا چاہتا ہوں..... آپ ہیں ضرغام غوری..... اپنا introduction یہ خود کروائیں گے.....'' انھوں نے اپنے دائیں ہاتھ پر بیٹھے ایک تیس بتیس سالہ مرد کی طرف اشارہ کیا، جس کی ذہانت سے چمکتی گہری بھوری آنکھیں اور پر وقار شخصیت اسے یہاں پر موجود تمام لوگوں سے ممتاز کر رہی تھی۔ گو کہ یہاں موجود باقی لوگ بھی اپنی اپنی فیلڈ میں بہت کامیاب اور ذہین تھے لیکن ضرغام کی شخصیت کی سحر انگیزی سے وہ بھی مرعوب نظر آ رہے تھے۔

''بائے پروفیشن میں New Era میگزین کے لیے رپورٹنگ کرتا ہوں لیکن زیادہ تر فری لانسنگ کرتا ہوں اس لیے آپ لوگ مجھے بھی اپنی ہی کیٹیگری کا سمجھیے... میں بس ایک عام سا انسان ہوں جو ایک دردمند دل رکھتا ہے.....'' اس کے ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ تھی۔ سب لوگ اس کے پر وقار انداز اور لہجے سے بے حد متاثر تھے۔

''ہماری اس N.G.O میں شامل ہونے کی کوئی خاص وجہ ..... جبکہ ہمارے اس ادارے کوشروع ہوئے ابھی بمشکل تین برس ہوئے ہیں اور آپ کی شخصیت کی سحر انگیزی کہتی ہے کہ آپ کوتو بڑی سے بڑی این۔جی۔او زبھی خوش آمدید کہہ سکتی ہیں'' اچانک ہی اس کی سامنے کی رو میں تیسری نشست پر بیٹھی محترمہ نے جانچتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا تو ضرغام اس کی آنکھوں میں ابھرتی شک کی پرچھائیاں دیکھ کر اپنی بے اختیار امڈ آنے والی مسکراہٹ کوروک نہیں پایا۔

''مس!.....'' اس نے جان بوجھ کر وقفہ لیا تا کہ وہ اپنا نام بتائے۔

''منہار آفندی.....'' اس کی توقع کے عین مطابق وہ فوراً بول پڑی۔

''جی تو مس منہار!.....میں ایک معمولی سا انسان ہوں اور کچھ کام کرنے کی نیت رکھتا ہوں.....اور مجھے لگتا ہے کہ میں اس این جی او کے ساتھ زیادہ خوش اسلوبی سے وہ کام کر سکوں گا۔.....'' ضرغام نے جتلانے کے انداز میں کہا تو منہار اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گئی۔

''میرے خیال سے اب لائحہ عمل پر بات ہو جائے.....'' وجاہت حسن کے کہنے پر سب باری باری اپنی تجاویز پیش کرنے لگے اور پھر تمام تجاویز پر غور کرنے کے بعد سب نے ٹی وی پر امداد کی اپیل کرنے پر اتفاق کیا۔

''تو پھر طے رہا کہ ہم ٹی وی کے وقت کے کچھ گھنٹے خرید لیتے ہیں اور یہ کام ضرغام کرے گا.....اور منہار تم ....جو یہ تین نام ہم نے سلیبر ٹی کے سلیکٹ کیے ہیں ان میں سے کسی ایک کو لازمی اس شو میں شرکت کرنے کے لیے راضی کرنا ہے.....اس کے علاوہ اگر ٹی وی یا فلم کی کچھ اور شخصیات بھی آجائیں تو ہمارے لیے بہت اچھا ہوگا .....'' وجاہت حسن ہی وہ انسان تھے جنھوں نے اس این۔جی۔او کی بنیاد رکھی اور پھر آہستہ آہستہ اس میں باقی ممبران شامل ہوتے گئے اس لیے آخری فیصلہ ہمیشہ انھی کا ہوا کرتا تھا۔

آج بھی انھوں نے سب کے ذمے الگ الگ ڈیوٹی لگائی اور پھر میٹنگ برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

☆ ☆ ☆

پچھلے تین دنوں سے وہ سب مسلسل بھاگ دوڑ میں مصروف تھے۔

ایک live show آن ائیر کروانے کے لیے انھیں کافی ذہنی اور جسمانی مشقت کرنی پڑ رہی تھی۔اس پراجیکٹ نے انھیں کھانے پینے کا ہوش بھلا رکھا تھا۔آج بھی وہ ٹی وی سٹیشن سے مغز ذنی کر کے آ رہا تھا کہ راستے میں ایک سیلف سروس ریسٹورنٹ کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ صبح جلدی میں وہ ناشتے کے نام پر صرف چائے کا ایک کپ پی کر ہی نکل آیا تھا اور اب بھوک زوروں پر تھی۔اس نے بائیک کا رخ اس ریسٹورنٹ کی طرف کر دیا۔کاؤنٹر سے برگر اور بوتل لیکر اس نے بیٹھنے کے لیے کسی مناسب جگہ کی تلاش میں نظریں دوڑائیں تو اس کی نظریں کارنر میں گلاس ونڈو کے ساتھ ٹیبل پر اکیلی بیٹھی منہار پر جا کر ٹھہر گئیں۔وہ گلاس ونڈو پر نظریں جمائے بیٹھی تھی اور اس کے سامنے پڑے گلاس میں شاید کوئی جوس تھا۔وہ مسکراتے ہوئے اسی کے پاس چلا آیا۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟'' ضرغام نے آہستہ سے ٹیبل بجاتے ہوئے کہا تو وہ جو باہر دیکھنے میں مگن تھی اس کی آواز سن کر چونک اٹھی۔

''آپ....؟''

''جی میں .....'' اس نے ہاتھ میں پکڑی ٹرے ٹیبل پر رکھی اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ منہار نے اس کے یوں بیٹھنے پر اگر اسے ویلکم نہیں کہا تھا تو اس کے انداز سے کوئی اعتراض بھی نہیں ظاہر ہوا تھا،بس خاموشی سے دوبارہ اپنے گلاس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ضرغام بہت غور سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہا تھا۔

''کیا بات ہے....اینی پرابلم.....؟'' ضرغام نے کولڈ ڈرنک کا سپ لیکر دوستانہ انداز میں پوچھا۔

''نو....ناٹ ایٹ آل.....''اس نے آہستہ سے مسکراتے ہوئے کہا لیکن اس کی مسکراہٹ اس کی آنکھوں کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

''اب آپ کہہ رہی ہیں تو مان لیتا ہوں ورنہ آپ کی آنکھیں تو خود آپ کے جھوٹ کی چغلی کھا رہی ہیں.....'' اس نے برگر سے پوری طرح انصاف کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''ہا.....لوگ اتنے خودغرض ہو چکے ہیں کہ اس خودغرضی کا احساس بھی ان کے اندر مر چکا ہے'' اس کا لہجہ کچھ کھویا ہوا سا تھا۔

''اگر میں غلط نہیں ہوں تو اس فیلڈ میں آئے آپ کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا.....ابھی تو آپ نے پہلی ہی سیڑھی پر قدم رکھا ہے....ابھی سے گھبرا گئیں.....''

''آپ کا اندازہ غلط نہیں۔میں نے حال ہی میں اپنا ماسٹرز کمپلیٹ کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی سوشل ورک کرنے کا بھوت سر پر سوار ہو گیا تو میں نے وجاہت انکل کی این جی او جوائن کر لی.... یہاں آنے کے بعد احساس ہو رہا ہے کہ تھیوری اور پریکٹیکل میں کتنا فرق ہے'' وہ اب اس ہیجانی کیفیت سے باہر آ رہی تھی جس نے اسے ایکدم ہی دنیا سے بیزار سا کر دیا تھا۔

''منہار! تمھاری یہ فیلنگز انوکھی نہیں ....سوشل ورک میں ماسٹرز کرنے والے جب پریکٹیکل لائف میں آتے ہیں تو کم وبیش ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہیں .....دنیا کو بدلنے کی بات کرنے والے اکثر اپنے آپ کو بھی بدل نہیں پاتے اور اسی سسٹم کا حصہ بن جاتے ہیں یا بننے پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں....تم بھی آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گی ان سب

باتوں کی۔ پھر یہ تمھیں اتنا پریشان نہیں کریں گی'' اس نے بڑے ہی غیر محسوس انداز میں تکلف کی دیوار گرائی تھی۔

''اچھا.....اس کا مطلب، آپ عادی ہو چکے ہیں.....'' منہار نے ایک طنزیہ نظر اس پر ڈالی اور کافی کا سپ لینے لگی۔

اس کی فطری برجستگی لوٹ آئی تھی اور ضرغام کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

''یس آف کورس ....لیکن اس کے باوجود میرا passion، میرے اصول اپنی جگہ پر قائم ہیں.... کیسے .....اس کے لیے فائیٹ کرنی پڑتی ہے .... سسٹم سے ....اپنے آپ سے.....''

''جو میں آپ کے خیال میں نہیں کر رہی یا نہیں کر سکتی....'' اس کا لہجہ ہلکی سی خفگی لیے ہوئے تھا۔

''میرا ہرگز ایسا کوئی خیال نہیں بلکہ تم فائیٹ کر رہی ہو اس لیے ڈسٹرب ہو ورنہ مطمئن ہوتیں.....'' ضرغام نے کہا تو اس کا چہرہ ایکدم پرسکون ہو گیا۔

''ہاں شاید ایسا ہی ہے۔ لوگوں کے رویے مجھے بہت ڈسٹرب کرتے ہیں.... پتا نہیں میں زیادہ حساس ہوں یا لوگ ہی بے حس ہو چکے ہیں.....اب خان صاحب کو ہی دیکھ لیجیے جب میں نے ان سے اپنے'' کاز'' کے لیے ہمارے ساتھ شامل ہونے کی بات کی تو سب سے پہلے انھوں نے پوچھا کہ انھیں pay کیا کیا جائے گا اور ساتھ ہی یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہم ٹی وی پر یہ ظاہر کریں کہ وہ فی سبیل اللہ اس پروگرام میں شرکت کر رہے ہیں.....کس قدر دو غلے لوگ ہیں، ہر جگہ صرف اپنا فائدہ دیکھتے ہیں.....'' آخر کار وہ اصل بات زبان پر لے ہی آئی اور اس میں کمال اس کا نہیں بلکہ ضرغام کی سحر انگیز شخصیت کا تھا جو مقابل کو چت کر کے اپنا آپ ظاہر کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔

''ویسے اگر دیکھا جائے تو اس میں قصور ان کا بھی نہیں۔ جو معاشرے نے انھیں دیا ہے، وہ اسے ہی لوٹا رہے ہیں..... نجانے کتنی مصیبتوں اور مشکلات کا سامنا کر کے وہ اس مقام تک پہنچے ہیں۔ اب اگر وہ اپنی اس پوزیشن کو کیش کروانا چاہتے ہیں تو اس میں غلط کیا ہے'' اس نے ڈرنک کا آخری سپ لیکر ترچھی نظروں سے اسے دیکھا جواب سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ مقابل کو اپنی طرح سوچنے پر مجبور کر چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

Live show کی ڈیٹ آج سے دو دن بعد کی فائنل ہو گئی تھی اور اس لیے وہ سب آج پھر اس میٹنگ روم میں موجود تھے۔

''میرے خیال سے تمام انتظامات مکمل ہو گئے ہیں'' وجاہت حسن نے باری باری سب کے چہروں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''سر! آئی ایم شیور کہ جو ٹارگٹ ہم نے سیٹ کیا ہے، اتنی ڈونیشن تو ہم ضرور حاصل کر لیں گے'' منہار بہت ہی پر جوش نظر آ رہی تھی۔

''بٹ آئی ایم ناٹ....'' ضرغام نے اچانک کہا تو وہ سب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

''واٹ!.....what did you say?'' منہار نے فوراً کہا۔

''آئی سیڈ آئی ایم ناٹ.....'' اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

''کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ کیوں.....'' منہار نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاں ضرغام!.....ہم سب بھی جاننا چاہتے ہیں کہ تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو.....وہ بھی تب جب سب کچھ فائنلائز ہو چکا ہے'' وجاہت حسن بھی اب کچھ مضطرب نظر آ رہے تھے۔

''میں یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ آپ کا ٹارگٹ achievable نہیں .... ہے بالکل ہے..... لیکن ..... اس ٹارگٹ کے لیے جو پراسس اختیار کیا گیا ہے وہ بہت

expensive ہو چکا ہے.....ہمارے اخراجات بہت زیادہ ہیں، ایسے میں.....''

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی عدیل الزماں بول پڑے،

''ینگ مین! یہ تم نہیں تمھاری ناتجربہ کاری بول رہی ہے.....میں پچھلے پانچ سالوں میں مختلف این جی اوز کے ساتھ کام کر چکا ہوں اور میں نے اس سے کہیں زیادہ expenses ہوتے دیکھے ہیں جو بعد میں cover up ہو جاتے ہیں.....ایسے معاملوں میں اتنا رسک تو لینا پڑتا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ ہم نے کچھ غلط کیا ہے.... کیوں.....کیا آپ میں سے کوئی اور بھی ضرغام کا ہم خیال ہے.....'' عدیل الزماں نے باری باری سب پر نظر ڈالتے ہوئے کہا تو ان میں سے ہر کوئی انھیں اپنا حمایتی ہی نظر آیا، ویسے بھی وہ اس این جی او کے سینئر ترین شخص ہونے کے ساتھ ساتھ آرمی کے ریٹائرڈ کرنل بھی تھے، اس لیے وہ سب ان کی رائے کا احترام کرتے تھے۔

''او کے ایز یو وش.....'' ضرغام نے بھی مزید بحث سے احتراز ہی کیا کہ جب کوئی اس کی بات کو اہمیت دینے کو تیار ہی نہیں تھا تو وہ کیوں ان سے حجت کرتا۔

''بہر حال ضرغام کی بات میں وزن تو ہے.....اور اگر صورتحال وہی ہوگئی جو یہ کہہ رہا ہے تو.....'' وجاہت حسن تذبذب میں پڑ گئے۔

''وجاہت!.....کیا اس سے پہلے ہم نے رسک نہیں لیے جو آج گھبرا رہے ہو.....'' عدیل الزماں انھیں سوچ میں پڑتا دیکھ کر چپ نہ رہ سکے۔

''میرے خیال سے تو سر! یہ سب سے بہترین لائحہ عمل تھا'' منہار بھی انھی کی ہمنوا تھی۔

''ہاں....ٹھیک ہے.....اب اور ہو بھی کیا سکتا ہے....'' انھوں نے ایک گہرا سانس بھر کر نیم رضامندی سے کہا۔ صاف ظاہر تھا کہ کہیں نہ کہیں وہ بھی ضرغام سے متفق ہیں لیکن اتنے سارے لوگوں کی رائے سے انحراف نہیں کر پا رہے تھے۔ ضرغام بھی ان کی مجبوری سمجھ

رہا تھا، اس لیے خاموش ہو گیا۔

اور پھر پرسوں ہونے والے live show کے بارے میں کچھ فائنل discussions کی گئیں جس میں ضرغام کی حیثیت ایک خاموش تماشائی سے زیادہ نہ تھی اور اس نے خود بھی اپنی اس حیثیت کو بدلنے کی کوشش نہیں کی تھی ورنہ وہ چاہتا تو ان سب کو قائل کرنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگنی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا کیونکہ وہ ابھی خود بھی اتنا sure نہیں تھا۔ یہ اس کا فرسٹ experience تھا۔ اس کے باوجود اسے لگتا تھا کہ وہ غلط راستے پر جا رہے ہیں، جس کا اس نے اظہار کر دیا، اگر اس کی رائے کو اہمیت دی جاتی تو شاید اس پر بات کر کے وہ کسی مناسب نتیجے پر پہنچ جاتے لیکن جس انداز میں اس کی بات کو رد کیا گیا تھا، اس نے اسے خاموش ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ضرغام اس وقت منہار کے ساتھ ٹی وی سٹیشن میں ہی موجود تھا۔ وہ دونوں اس وقت جس کمرے میں موجود تھے وہاں سے وہ نہ صرف کمپئیر اور خان صاحب کو دیکھ رہے تھے بلکہ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی سن رہے تھے۔

کمپئیر کی کسی بات کے جواب میں خان صاحب کہہ رہے تھے۔

''یہ تباہی کیوں ہوئی..... کیسے ہوئی..... ان سوالوں سے زیادہ اہم یہ ہے کہ اس تباہی کا شکار ہونے والے ہمارے ہی بہن بھائی ہیں اور اس وقت انھیں ہماری مدد کی اشد ضرورت ہے..... تو یہ مت سوچیے کہ آپ کیا دے رہے ہیں بلکہ یہ سوچیں کہ کسے دے رہے ہیں..... قطرہ قطرہ مل کر ہی سمندر بنتا ہے، اکیلا قطرہ بے حقیقت ہے لیکن جب وہ اپنی شناخت کھو کر سمندر میں ضم ہوتا ہے تو قلزم بن جاتا ہے..... اس لیے اپنے ہاتھ میں موجود ایک نوٹ کو دیکھ کر افسردہ مت ہوں کیونکہ ایسے بہت سے ہاتھ مل کر ہی سمندر کا روپ دھاریں گے.....

سوچیے مت اور آگے بڑھ کر اس سمندر میں اپنا حصہ ڈال دیجیے.....''

'' بھئی ماننا پڑے گا کہ اس کی شخصیت کی طرح اس کی باتیں بھی سحر انگیز ہیں .... لفظوں سے کھیلنے کا فن بخوبی جانتے ہیں موصوف.....کاش اس کی شخصیت کا وہ روپ میں نے نہ دیکھا ہوتا تو آج اس کی شخصیت اور باتیں مجھ پر بھی وہی سحر طاری کر دیتیں جو اس وقت ٹی وی دیکھنے والوں پر ہو رہا ہوگا'' منہار بیک وقت اس سے متاثر بھی تھی اور اس کی شخصیت کے دوہرے پن سے نالاں بھی۔

'' کیا میں اپنی اس دن کی بات دہراؤں....'' ضرغام نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرا اٹھی۔

''نہیں.....اس کی ضرورت نہیں''

اسی وقت چپراسی اندر داخل ہوا اور چائے کے دو کپ ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا۔ وہ دونوں گلاس ڈور کے سامنے سے ہٹ کر صوفوں پر آ بیٹھے۔

'' ویسے ایک بات کہوں....تم بہت ambitious ہو'' ضرغام نے کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

'' کیا ambitious ہونا غلط ہے....؟'' اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''نہیں.....لیکن ambitious ہونے کے ساتھ ساتھ تم بہت شدت پسند بھی ہو اور یہ اگر غلط نہیں تو صحیح بھی نہیں کیونکہ اس کا تمھیں نقصان ہو سکتا ہے''

'' کیسے.....؟'' اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

'' یہ شدت پسندی ہی تو ہے جو تمھیں لوگوں سے اتنی جلدی متنفر کر دیتی ہے جبکہ اس فیلڈ میں آنے کے بعد تو تمھیں قدم قدم پر ایسی دوہری شخصیتوں سے واسطہ پڑے گا اور جس طرح سے تم بد دلی کا شکار ہوا ایسے تو تمھارا کیریئر شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گا''

''میں کیا کروں....مجھ سے دوغلا پن برداشت نہیں ہوتا'' اس نے بے بسی سے کہا تو وہ اس کی معصومیت پر مسکرا اٹھا۔

''تم اسے ایسے کیوں نہیں لیتیں کہ یہ دوہرا پن ان کی مجبوری ہے....دیکھو تم یہ تو مانتی ہو نا کہ کوئی بھی انسان پرفیکٹ نہیں ہوتا۔ ہر انسان میں کوئی نہ کوئی خامی یا کمی موجود ہوتی ہے....تو اسے بھی تم ان خامیوں میں سے ایک خامی سمجھو....''

''ایک ایسی خامی جو شاید اب ان کی ضرورت بن چکی ہے....ہے نا.....''اس نے پھیکی سی ہنسی ہنس کر کہا۔

''دیٹس رائٹ.....اب تم صحیح ٹریک پر جا رہی ہو.....ضرورت اور مجبوری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ ضرورت ہی تو ہے جو مجبوری کو جنم دیتی ہے اور انسان کو بے بسی کے بحر بیکراں میں پھینک دیتی ہے.....اب زلزلے سے تباہ شدہ لوگوں کو ہی لے لو۔اس میں ان بیچاروں کا کیا قصور کہ انھیں یوں اپنے ہی جیسے انسانوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پڑ رہے ہیں لیکن یہ ان کی ضرورت ہے جس نے انھیں مجبور کر دیا ہے.....بھوک، پیاس یہ سب زندگی کی ضرورتیں ہی تو ہیں.....ایسے ہی ہر انسان اپنی اپنی ضرورتوں کے آگے مجبور ہے اور یہی ضرورتیں کبھی کبھی انسانوں سے وہ کچھ کروا لیتی ہیں کہ انسانیت بھی شرما جائے لیکن مجبوری.....'' اس کی باتیں اتنی مدلّل تھیں کہ وہ اسے رد نہیں کر سکی۔

''شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ..... مجھے سوچنے کا انداز بدلنا ہوگا''اس نے کہا اور چائے پینے میں مشغول ہوگئی۔

☆ ☆ ☆

شو شروع ہونے سے پہلے ان سب کے دلوں میں کہیں نہ کہیں ایک بے چینی سی تھی۔ ضرغام کی باتوں نے ان کے دل کو چھوا ضرور تھا لیکن وہ ایک ناتجربہ کار نوجوان کی باتوں کو

ماننے پر تیار نہ تھے۔ پھر شو کے اینڈ تک یہ بے چینی بھی ختم ہو چکی تھی کیونکہ اس کا response بہت اچھا رہا تھا اور کسی حد تک وہ اپنا ٹارگٹ پورا کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ پہلا مرحلہ بخوبی انجام پا گیا تھا اور اب باری تھی دوسرے اور سب سے اہم مرحلے کی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ کیا expenses نکال کر بھی نتیجہ ان کی توقع کے مطابق نکلتا ہے یا نہیں۔ یہ دیکھنے کے لیے وہ سب کام میں مشغول ہو گئے۔

خان صاحب کے دیئے گئے قیمتی وقت کا اعزاز یہ منہار خود ان کے گھر پہنچا کر آئی تھی جو اس کے بقول اس کے بدلے ہوئے مثبت انداز فکر کی دلیل تھی اور ضرغام نے بھی اس کے اس اقدام کو سراہا تھا۔ پھر ٹی وی ٹائم کا خرچ اور چونکہ پہلے سے طے شدہ وقت سے ایک گھنٹا زیادہ لے لیا گیا تھا اس لیے انھیں اس کے علیحدہ چارجز ادا کرنے پڑے۔ اس سے فارغ ہوئے تو وہ بینک جس نے ملک بھر سے آنے والی رقوم کو محفوظ کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کی تھیں، ان خدمات کے عوض جمع کی گئی کل رقم سے اس نے اپنا پہلے سے طے شدہ percentage share لینے میں ذرا بھی تامل نہ کیا۔ شو میں شریک کچھ فلم کی شخصیات کو بھی پے کیا گیا اسی طرح کچھ اور دوسرے چھوٹے موٹے اخراجات نکال کر جب بچی کھچی رقم دیکھی گئی تو ان سب کے دماغ بھک سے اڑ گئے۔ سب حیران پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ صرف ایک ضرغام ہی تھا جس کا چہرہ سپاٹ اور ہر قسم کے تاثر سے عاری تھا۔

''یہ..... یہ تو کچھ بھی نہیں جمع ہوا....'' سب سے پہلے منہار نے ہی اپنے جذبوں کو زبان دی۔

''حیران تو میں بھی ہوں کہ ایسا کیسے ہو گیا.... ایسا ہونا تو نہیں چاہیے تھا'' وجاہت حسن نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پریشانی کے عالم میں کہا۔ سب ہی کم و بیش ایک

جیسے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔

''عدیل صاحب!.....آپ کچھ نہیں کہہ رہے'' ضرغام نے بغور ان کی طرف دیکھا تو وہ پہلو بدل کر رہ گئے۔

''میں.....میں کیا کہوں.....'' ان سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔

'' یہ صورتحال تو تشویش ناک ہے.... ہماری اتنے دنوں کی محنت کا نتیجہ ناکامی کی صورت میں نکلا ہے.....ویری بیڈ.....'' وجاہت حسن نے تاسف سے میز پر مکا مارتے ہوئے کہا۔

''یہ تو کچھ بھی حاصل نہ ہوا.....اس سے زیادہ تو ہم چھوٹی موٹی campaign سے اکٹھا کر لیتے.....اتنی بھاگ دوڑ کے بعد یہ رزلٹ .....it's horrible'' منہار بھی بہت مایوس نظر آ رہی تھی۔

ماحول ایکدم ہی بوجھل سا ہو گیا تھا۔سب ہی کے چہرے مایوسی سے لٹک گئے تھے۔ہر کوئی اپنی اپنی جگہ سوچ میں گم تھا۔کمرے میں اچانک گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ضرغام نے باری باری سب کے اترے ہوئے چہرے دیکھے اور کہنے لگا۔

''آپ سب تو ایک دم ہی ہمت ہار بیٹھے ہیں.....یہ ٹھیک ہے کہ ہم ناکام رہے ہیں۔ لیکن ناکامی کا مطلب یہ تو نہیں کہ آگے بڑھنے کی بجائے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں.....اور پھر آپ یہ سوچیں کہ ہم نے کم از کم ایک کوشش تو کی اپنے طور سے ان لوگوں کے لیے کچھ کرنے کی، یہ الگ بات ہے کہ حالات ہمارے خلاف چلے گئے۔ورنہ تو ایسی این جی اوز بھی ہیں جن کے پاس ڈونیشن میں حاصل کی گئی رقوم لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں تک پہنچ گئیں لیکن ان لوگوں تک نہ پہنچ سکیں جن کے نام پر اکٹھی کی گئی تھیں....ان کے بارے میں کیا کہیں گے آپ جو بہت کچھ کر سکتے تھے لیکن کرنا نہیں چاہتے....آپ کم از کم کرنا

تو چاہتے ہیں، کیا ہوا اگر حالات ایک بار ہمارے مخالف ہو گئے تو.....ہم دوبارہ کوشش کر سکتے ہیں'' ضرغام کے لفظوں نے ان کی ہمت بندھائی اور ان سب کے چہروں پر چھائے مایوسی کے بادل کسی حد تک چھٹنے لگے۔

''ضرغام ٹھیک کہہ رہا ہے .....ہمیں حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے'' وجاہت حسن پھر سے پُر امید نظر آنے لگے۔

''تو کیا ہمیں پھر نئے سرے سے شروعات کرنی ہوگی'' منہار نے اچانک پوچھا۔

''بالکل.....ہم ایک نئی امید کے ساتھ نئی شروعات کریں گے اور اس یقین کے ساتھ کہ اس بار ہمیں ناکام نہیں ہونا کیونکہ یہ ناکامی صرف ہماری نہیں ہوگی بلکہ ان ہزاروں لوگوں کی ہوگی جو زندگی اور موت کے بیچ ڈول رہے ہیں۔ہمیں کامیاب ہو کر انھیں زندگی کی طرف واپس لانا ہے ..... بے شک ایک بار پھر ہم وہیں آ کھڑے ہوئے ہیں جہاں سے چلے تھے لیکن ہماری امید زندہ ہے، ہمارے حوصلے جوان ہیں.....اور اس بار ہمیں اپنی پوری قوت لگانی ہے اور زندگی کی اس جنگ کو جیتنا ہے .....'' ضرغام نے اپنے مخصوص مسحور کن انداز میں کہا تو ان سب کے چہروں پر پھر سے وہی خود اعتمادی لوٹ آئی جو اس پراجیکٹ کو شروع کرتے ہوئے تھی۔

☆ ☆ ☆

زلزلہ.....

آدم تا ایں دم

زلزلہ..... ایک مستند مطالعہ

زلزلہ کیا ہے؟

لفظ ''زلزلہ'' عربی زبان سے مستعار ہے جس کا مفہوم ہے، زمین کا لرز اٹھنا، ہلنا، کانپنا۔

ہندی زبان میں زلزلہ کے لیے بھونچال یا ہالا ڈولا جیسے الفاظ ملتے ہیں۔

انگریزی میں اسے Earthquake کہتے ہیں۔

زلزلے زمین پر اس کی تعمیر کے ساتھ ہی جاری ہو گئے تھے۔

قرآن پاک میں گزشتہ نافرمان اقوام کی تباہی میں زمین کا شق ہونا اور پہاڑوں پتھروں کا گرنا نیز بستی کا الٹنا درج ہے۔ یہ سب علامات شدید زلازِل کی ہی ہیں جو امر ربی سے عذاب بن گئے۔

موہنجوداڑو، ہڑپا اور بابل کے کھنڈرات زلازِل کا نتیجہ بھی ہو سکتے ہیں۔

سائنس کا خیال ہے کہ کرہ ارض کی عمر چار ارب 60 کروڑ سال ہے۔ زمین کو تمام قدرتی تغیرات میں سب سے زیادہ الٹ پلٹ زلزلوں نے ہی کیا۔ ماضی میں زمین کے بڑے بڑے تغیرات کے پیچھے زلزلے بھی کارفرما تھے۔ مثلاً بلند و بالا پہاڑ ابھرنا اور صحرا بننا، گہری گھاٹیاں اور سطح مرتفع زمین کا ٹکڑوں (براعظموں) میں بٹ جانا اور جزیروں، سمندروں کا وجود میں آنا..... زلزلوں سے کسی نہ کسی طرح منسلک کیا جاتا ہے۔

زلزلہ کیوں آتا ہے؟

قدیم ہندوستان میں ایک نظریہ چلا آ رہا ہے کہ زمین کے نیچے ایک پہاڑ گائے کھڑی

ہے جس نے زمین کو اپنے ایک سینگ پر اٹھا رکھا ہے۔ جب کبھی وہ تھک جاتی ہے تو اپنا سینگ بدلتی ہے، تب بھونچال آتا ہے۔ یہ نظریہ غالباً گائے کی افادیت بیان کرنے کے لیے گھڑا گیا ہوگا۔ بہرحال یہ نظریہ کم اور لطیفہ زیادہ ہے۔ مصری اور یونانی لوگ اسے دیوتاؤں کا غضب گردانتے تھے۔

سائنس کی تحقیق اس سے بالکل مختلف ہے۔

زلزلے کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ آتش فشاں پہاڑ پھٹنے سے زلزلہ آتا ہے۔ کسی حد تک یہ بات درست ہے۔ تاہم زلزلہ آتش فشانی کے بغیر بھی آجاتا ہے۔

ہماری زمین جس طرح عام سطح پر یکساں اور متوازن دکھائی دیتی ہے۔ درحقیقت گہرائی میں اس کے بالکل برعکس ہے۔ ماہر ارضیات جدید تحقیق کے بعد اسے مختلف درجات میں تقسیم کرتے ہیں، زمین کا اندرونی خول سات سخت چٹانی پلیٹوں سے بنا ہوا ہے۔ یہ پلیٹیں مسلسل حرکت کرتی رہتی ہیں۔ اسی دوران اس عمل سے ایک خاص قسم کی توانائی پیدا ہوتی ہے جو وہاں جمع ہونے کے بعد ایک خاص مقدار سے خارج ہوتی ہے۔ یہی خاص قسم کی توانائی زلزلے کا باعث بن جاتی ہے۔ اس تبدیلی سے Seismic Waves پیدا ہوتی ہیں جو زبردست ارتعاش پیدا کرتی ہیں۔ سائنس دانوں کے مطابق ارضی پلیٹوں میں حرکت کا عمل بہت سست ہوتا ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ یہ پلیٹیں تھوڑا بہت کھسک جاتی ہیں تو تباہ کن زلزلے کا سبب بنتی ہیں۔ پلیٹ سرکنے کا عمل اس مقام پر ہوتا ہے جہاں سے کوئی لہر یا فالٹ گزرتی ہے۔ علم طبقات ارضی میں فالٹ Fault اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں دو پلیٹیں آپس میں ملتی ہیں۔ ماضی قریب میں جو زلزلے افغانستان و ایران میں آئے تھے ان کی کیفیت بالکل ایسی ہی تھی کہ اچانک کوئی پلیٹ بہت زیادہ کھسک جائے تو زلزلے کی سی

کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔لہٰذا8 اکتوبر 2005ء کو جو زلزلہ وطن عزیز میں آیا ہے اس کی شدت جاپانی ریکٹر سکیل پر 7.8 ریکارڈ کی گئی ہے۔

تقریباً100 سے 200 کلومیٹر کی گہرائی میں جا کر وہ مقام ہے جسے زمین کا میٹل کہا جاتا ہے۔وہاں پلیٹ گرم ہو کر گھلنے لگتی ہے۔ یہاں چٹانیں اور پتھر آس پاس کی چٹانوں اور پتھروں سے کم کثیف ہوتے ہیں۔ اس عمل سے گرم پگھلی ہوئی چٹانیں (جنہیں عام اصطلاح میں لاوا کہتے ہیں)اوپر کی سطح کی جانب اٹھنے لگتی ہیں۔اس عمل کی بنا پر بحرالکاہل کی اطراف میں آتش فشاں پہاڑوں کا بہت وسیع دائرہ ہے، جسے آتشی حلقہ کہا جاتا ہے۔اس کے آس پاس کے علاقوں میں زلزلے آنے کی بنیادی وجہ زمین کے وسط سے اوپر اٹھنے والا لاوا (میگما) ہوتا ہے جو آتش فشاں کے دہانوں سے خارج ہوتے ہوئے بالائی پلیٹوں کو دھکیلتا ہے اور اسی بنا پر پلیٹوں کے حرکت میں آنے سے زلزلہ آتا ہے۔26 دسمبر 2004ء کی صبح بحر ہند میں ایک ایسی ہی آتشی قیامت سمندری زلزلے کی صورت میں بپا ہوئی جس نے انڈونیشیا پر ایک قیامت صغریٰ کی صورت نازل کر دی جس سے پوری دنیا ہل کر رہ گئی۔ اس کے جھٹکے کینیا اور صومالیہ تک محسوس ہوئے ریکٹر سکیل پر اس زلزلے کی شدت 9 درجے ریکارڈ کی گئی۔اس زلزلے نے تقریباً3 لاکھ افراد کو نگل لیا اور ڈیڑھ لاکھ لاپتا ہیں۔

زلزلے کی شدت کیسے معلوم کی جاتی ہے؟

زلزے کی شدت اور طاقت کا اندازہ لگانے کے لئے کئی طریقے مستعمل ہیں۔ایک تو سطحی بلندی ہے لیکن پھر بھی اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ زلزلہ کتنی گہرائی میں آیا۔زلزلہ جتنی زیادہ گہرائی سے ابھرے گا اتنی ہی کم تبدیلی واقع ہوگی۔اگر اس کا مرکز سطح زمین سے قریب ہوگا تو بہت زیادہ تبدیلی واقع ہوگی، زلزلہ شدید ہوگا۔

زلزلے کی شدت جاننے کا ذریعہ یہ بھی ہے کہ زلزلہ کتنے بڑے علاقے میں تبدیلی کا سبب بنا، اس کا پھیلاؤ کہاں تک تھا۔ الاسکا کے زلزلے میں متاثرہ علاقہ 77000 مربع میل تک تھا۔ جب کہ 1906ء میں سان فرانسسکو کے زلزلے میں اس کی 600 میل طویل فالٹ میں سے 250 میل کھسکی تھی۔

زلزلہ ماپنے کا تیسرا ذریعہ زلزلے کی طوالتِ وقت ہے کہ جھٹکے کب تک جاری رہے۔

ریکٹر سکیل زلزلہ پیمائی کا ایک خاص قسم کا آلہ ہے جو زلزلے سے پیدا ہونے والی زمینی حرکت کی پیمائش کرتا ہے۔

ماہرین زلزلیات نے زلزلے کی شدت ناپنے کے لئے ایک سکیل بین الاقوامی سطح پر مستند سمجھا ہے جسے اس کے موجد کے نام پر رچر سکیل Richter Scale کہتے ہیں۔ یہ صفر سے نو تک کا پیمانہ ہے۔ تاہم خدانخواستہ اگر زلزلہ نو سکیل سے زیادہ کا آجائے تو بھی اسی سکیل پر ریکارڈ ہو جاتا ہے۔

زلزلے کی شدت کو Magnitude کہا جاتا ہے، جس آلے پر اسے ماپا جاتا ہے، اسے سیسمو میٹر کہتے ہیں، اس پر ریکارڈ شدت ہی نشر کی جاتی ہے۔ اس سکیل پر اب تک شدید ترین زلزلہ جو ریکارڈ کیا گیا اس کا Magnitude 809 تھا۔ 1995ء میں آچے، انڈونیشیا کے زلزلے کی شدت ریکٹر سکیل پر 9.3 تھی۔

برصغیر میں 1897ء سے لے کر 1997ء تک سیکڑوں زلزلے آئے۔ ان زلزلوں میں شدت کا اوسط پیمانہ 6 سے 7 ریکٹر سکیل نوٹ کیا گیا۔

ہماری ملکی تاریخ کا ایک بہت طاقت ور زلزلہ 28 نومبر 1945ء میں بھی آیا، شدت 8.6 تھی۔ 1905ء سے 2005ء تک ہماری سرزمین میں 154 ایسے چھوٹے بڑے

زلزلے آ چکے ہیں۔جن سے مالی وجانی نقصان ہوا۔

دنیا میں اب تک شدید ترین زلزلے کی شدت 9.5 ریکارڈ کی گئی ہے۔

انسان نے زلازِل کا باقاعدہ ریکارڈ اٹھارہویں عیسوی صدی سے رکھنا شروع کیا۔ تاہم قدیم تاریخ میں 4,500 قبل مسیح کے زلزلے کی شہادت ملتی ہے جو چین میں آیا تھا۔

ریکارڈ سے پہلے جو زلزلے اس دنیا میں آتے رہے ہیں، ان کی شدت 20.7 تھی یا 40.5..... مالک ہی جانتا ہے کہ ریکٹر سکیل تو ابھی سو دو سو سال کی بات ہے۔

کیا مصنوعی زلزلہ بھی پیدا کیا جا سکتا ہے؟

اس دور میں یہ ممکن ہے کہ مصنوعی بارش کی مانند ایک حد تک مصنوعی زلزلہ بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔سمندر میں کوئی بہت طاقت ور دھماکا سونامی پیدا کر سکتا ہے۔کسی زیرِ زمین ایٹمی دھماکے سے بھی محدود علاقے میں زلزلہ آ سکتا ہے۔ایسی کارروائی کرنے کے لیے علم زلزلیات (سیسموگرافی) کے ماہرین بتا سکتے ہیں کہ کون سے علاقے میں کتنی گہرائی پر ایسا دھماکا کیا جائے۔یہ بھی تو ممکن ہے کہ نازک مقام پر مصنوعی کوشش اصل زلزلہ ہی برپا کر دے۔

جدید دور میں زلزلے کی روک تھام اور پیشین گوئی:

جدید تحقیق سے اس بات کے ابھی تک قوی امکانات واضح نہیں ہو رہے کہ زلزلوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

زلزلے کے بارے دو باتیں ابھی تک حتمی ہیں اور شاید حتمی ہی رہیں گی کہ

اول: زلزلہ دنیا کے کسی بھی علاقے میں، کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔

دوم: زلزلے کی کوئی روک تھام نہیں کی جا سکتی۔

ہاں البتہ سائنس یہ ضرور بتا سکتی ہے کہ اس علاقے میں زلزلہ آنے کے امکانات کم یا زیادہ ہیں۔ یہ امکانات ماہرین کی اگلی تحقیق و تدقیق سے پہلے کم یا زیادہ بھی ہو سکتے ہیں اور شہروں کے شہر صفحۂ ہستی سے مٹ سکتے ہیں۔ زلزلہ دیگر آفاتِ سماوی مثلاً آندھی طوفان، بارش، سیلاب اور شدتِ موسم کی مانند انسانی قوت سے باہر ہے۔

1975ء میں زلزلے کی پہلی کامیاب پیشین گوئی کی گئی تھی جب چین کے شہر ہائی چینگ کے متعلق کئی گھنٹے پہلے بتا دیا گیا تھا کہ وہاں شدید زلزلہ آنے والا ہے مگر زلزلوں کے متعلق ہمیشہ درست پیشین گوئی بھی نہیں کی جا سکتی۔ البتہ واضح رہے کہ ماہرین کے نزدیک انسان کی نسبت جانور، کیڑے مکوڑے وغیرہ زلزلوں اور دیگر آفات کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔ جب زلزلہ آنے کا وقت قریب ہوتا ہے تو رینگتے ہوئے سانپ اپنے بلوں سے باہر نکل آتے ہیں، مرغیاں اپنے دڑبوں میں نہیں جاتیں بطخیں اپنے پروں کو پھڑ پھڑانا شروع کر دیتی ہیں۔ گھروں میں بندھے ہوئے جانور دیواروں سے اپنے سینگ رگڑ رگڑ کر ایک دوسرے کی دم چبانے لگتے ہیں اور اپنے بندھن تڑواتے ہیں۔ یہ حس جانوروں میں قدرت نے عطا کی ہوتی ہے۔

زلزلے کی احتیاطی تدابیر کے سلسلے میں اب عمارات زلزلہ پروف بھی بنائی جاتی ہیں جو مضبوط اور لچک دار ہوتی ہیں۔

جاپان جیسے ملک میں جہاں زلزلے بکثرت آتے ہیں، چوبی عمارات تعمیر کی جاتی ہے۔

بہت سی کنسٹرکشن فرمز عمارات کی بنیادوں کے نیچے شاک ابزار برز لگا کر بھی زلزلے کی احتیاطی تدبیر کرتی ہیں۔

عمارات زیادہ بلند نہیں بنانی چاہئیں۔

تعمیر میں خالص سامان استعمال کرنا چاہیے۔

1973ء میں Uniform Building Code متعارف کیا گیا تھا۔ یہ ایک بین الاقوامی میعارِ تعمیر ہے۔ اس کی بھی تقلید کرنی چاہیے۔

اگر کوئی عمارت زلزلے سے گر رہی ہو اور آپ باہر نہ نکل پائیں تو کسی مضبوط میز کے نیچے یا بیڈ کے نیچے گھس جانا چاہیے۔ ٹیڑھی دیواروں سے بچنا چاہیے۔

اگر عمارت کی صرف چھت گر رہی ہو تو کمرے کی نکڑ میں لگ کر بھی جان بچائی جاسکتی ہے۔

زلزلے کے جھٹکے اگر یکے بعد دیگرے آ رہے ہوں تو عمارت کے مکین کھلے آسمان تلے قیام کریں۔

کوہ ہندوکش..... برصغیر کے زلزلوں کا مرکز

ارضیاتی ماہرین کے مطابق کوہ ہندوکش کا سارا سلسلہ ایسے علاقے میں واقع ہے، جس کے نیچے کہیں بہت گہرائی میں زمین کے اندر خلا پایا جاتا ہے، جس کے باعث زمین کی مختلف سطحیں حرکت میں رہتی ہیں۔ سطحیں آپس میں ٹکراتی رہتی ہیں، ان کی وجہ سے کوئٹہ سے لے کر افغانستان اور وسطی ایشیائی ریاستوں تک پورا خطہ مسلسل لرزشوں اور جھٹکوں کی زد میں رہتا ہے۔ ہمارے ہاں بیشتر زلزلوں کا مرکز افغانستان میں کوہ ہندوکش کے علاقے میں پایا جاتا رہا ہے۔ کوہ ہندوکش کے خطے کے نیچے زلزلوں کا باعث بننے والی ایک طویل رینج موجود ہے جو ایک طرف افغانستان سے پشاور تک اور دوسری طرف شاہراہ قراقرم کے اردگرد کے علاقوں سے لے کر کوئٹہ اور مکران کے ساحل تک جاتی ہے۔

وطن عزیز میں ایک ہولناک زلزلہ کوہ ہندوکش کے سبب 3 مئی 1935ء کو کوئٹہ میں آیا

تھا جس میں 30 ہزار سے زائد لوگ لقمہ اجل بنے تھے اور کئی ہزار بے گھر ہوئے تھے اسی کے ساتھ ساتھ کروڑوں روپے کی املاک بھی تباہ ہوئی تھیں۔

سونامی بھی ایک زلزلہ ہی ہے

ایک بہت بڑا زلزلہ رچر سکیل پر شدت 9..... 26 دسمبر 2004ء کو سماٹرا کے مغربی ساحل پر آیا تھا۔

سونامی ایک جاپانی لفظ ہے جس کا مطلب ہے سمندر میں لہر یا سمندری لہر۔

سونامی کشش ثقل کا ایک ایسا سسٹم ہے جس کے تحت کشش ثقل کی لہریں سمندر میں پیدا ہوتی ہیں اور ایک وسیع پیمانے پر سمندر کی سطح پر تباہی مچا دیتی ہیں۔ بے شک یہ ہل چل تھوڑی دیر کے لیے ہوتی ہے مگر اس عرصے میں بھی اتنی تباہی پھیل جاتی ہے۔ اس زلزلے سے سمندر کا پانی بے قابو ہو کر کناروں سے اچھل پڑتا ہے اور پانی کو مدوجزر سے گزرنا پڑتا ہے۔ لہریں اپنے Source سے بہت دور سمندر کے کناروں سے نکل جاتی ہیں۔ پھر ان کے زورِ سیل کی زد میں آنے والی ہر شے تباہ ہو جاتی ہے، متاثر ہوتی ہے۔

سونامی کے پیدا ہونے کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں۔

1۔ سمندر میں سب میرین کا آتشی دھماکا۔

2۔ سمندر میں سب میرین کے آتشی مادے کی منتقلی کا حادثہ۔

3۔ سمندر کے اندر کی چٹانوں میں توڑ پھوڑ یا لینڈ سلائیڈنگ بھی سونامی کا باعث بن سکتے ہیں۔

4۔ اور سب سے اہم وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ سمندر کی سطح کسی کمزور حصہ کے باعث عمودی طور پر اوپر اٹھ جائے جس سے سمندر کا باقی فرش نیچے رہ جائے یہ بھی خطرناک سونامی کا باعث ہو سکتا ہے۔

5۔اس طرح سے سمندر کی زمین کا پھٹنا بھی ایک بہت بڑے سمندری زلزلے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

تمام سمندروں سے یا سمندر کے کناروں سے پرے جو زلزلے آتے ہیں، وہ سونامی نہیں ہوسکتے۔

سونامی کو پیدا کرنے والے زلزلے بہت کم گہرائی پر واقع ہوتے ہیں۔ بلاشبہ اوپر کی 50 کلومیٹر کے اندر اندر کیونکہ زلزلے اپنے فوکس سے اگر 70 کلومیٹر نیچے سے زمین کی سطح تک ہیں تو انہیں کم گہرائی کہیں گے اور اگر زمین کی سطح سے 300 کلومیٹر نیچے ہیں تو انہیں درمیانی گہرائی کہتے ہیں اور اگر اس سے نیچے 700 کلومیٹر تک ہیں تو انہیں بہت گہرا زلزلہ کہہ سکتے ہیں.....لیکن سونامی کا ظہور کم گہرائی پر زلزلہ کی وجہ سے ہوتا تھا۔

ہماری زمین مختلف پلیٹوں Plates پر گھری ہوئی ہے۔جن میں انڈین پلیٹ، یوریشین، شمالی امریکن پلیٹ، جنوبی امریکن، افریکن اور بے شمار چھوٹی پلیٹیں ہیں۔ یہ پلیٹیں گھومتی ہیں ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی ہیں، ایک دوسرے پر چڑھ جاتی ہیں، ایک دوسرے کو دھکیلتی ہیں اور ٹوٹی پھوٹتی ہیں لیکن سونامی جو 26 دسمبر 2004ء کو رونما ہوا جس میں تین لاکھ لوگوں کی جانیں گئیں، اس کے پیدا ہونے کی وجہ انڈین پلیٹ کا برما پلیٹ کے نیچے جانا تھا اور وہاں زمین کے میٹل کی طرف مڑنا تھا۔

تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ زلزلہ بذات خود سونامی نہیں بنتا بلکہ صرف اس کا سبب بنتا ہے۔لہٰذا سمندر کا پانی اوپر کی طرف پھیلتا جاتا ہے۔سونامی کی اطلاع دور دور تک محکمہ موسمیات پہنچا دیتا ہے مگر قریب کے لوگ مارے جاتے ہیں۔اس کی لہروں میں بہت شدت ہوتی ہے۔ یہ خوف ناک آواز کے ساتھ تیز رفتار گاڑی کی طرح آگے بڑھتا ہے۔اس کا ریلا 100 فٹ تک بھی سطح زمین پر بلند ہوسکتا ہے۔اسی سے ہی اس کی طاقت اور تباہی کا اندازہ ہوجاتا ہے۔

اس کے باوجود سونامی کا ریکارڈ دوسرے زمینی زلزلوں سے علیحدہ مرتب کیا جاتا ہے۔

دس بڑے زلزلے جو پاکستان میں آئے

سال	زلزلے کی شدت (MW)	علاقہ	جانی نقصان
893/894	7.5	(دیبل (زیر سندھ)	1500000
16-06-1819	7.5	الہ آباد (پاک بھارت سرحد)	3200
24-01-1859	.....	بلوچستان	350
20-11-1909	7	لورالائی، سبی	بہت سے گاؤں منہدم
1931	7	بلوچستان	بہت سے گاؤں منہدم
30-05-1935	8.1	کوئٹہ	30000
27-11-1945	7.9	مکران کوسٹ	2000
12-08-1947	7.2	مکران کوسٹ	5000
12-09-1981	6.1	گلگت	250
08-10-2005	8.6	شمالی علاقے	لاکھوں افراد

☆893/894 کے زلزلے کی شدت کا محض ایک اندازہ ہی لگایا گیا ہے۔

مشرقی ایشیاء کے بیس بڑے زلزلے

تاریخ	وقت	شدت (MW)	مقام
15-08-1950	14.09	8.6	بھارت، چین سرحد
16-06-1987	11.41	8.0	آسام، بھارت
15-01-1934	08.43	8.0	جنوبی بہار، نیپال سرحد
28-11-1945	21.56	8.0	مکران کوسٹ (پاکستان)
31-12-1881	01.49	7.9	کارنکوبار جزائر (بھارت)
04-04-1905	00.49	7.8	کانگرا (بھارت)
31-05-1935	21.32	7.7	کوئٹہ (پاکستان)
26-06-1941	11.52	8.1	جزائر انڈیمان (بھارت)
26-01-2001	03.16	7.6	بھوج (بھارت)
16-06-1819	.....	7.5	الہ آباد (بھارت)
26-12-1995	.....	9.3	آچے (انڈونیشیا)
08-10-2005	08.52	8.6	شمالی علاقے (پاکستان)
26-12-2003	.....	6.7	بم (ایران)
20-05-1990	.....	7.7	شمال مغربی ایران
28-07-1976	.....	7.8	ٹینگ شین (چین)
26-12-1939	.....	8	ارزنکان (ترکی)
23-05-1927	.....	8	گین زو (چین)
22-05-1927	.....	8	نین شان (چین)
01-09-1923	.....	8.2	یوکوہاما (جاپان)
16-12-1920	.....	8.5	لنگڑیا (چین)

دنیا بھر کے گزشتہ دس بڑے زلزلے

تاریخ	وقت	شدت (MW)	مقام
22-05-1960	19.10	9.5	شمالی چلی
28-03-1964	03.36	9.2	امریکا
09-03-1957	14.22	8.8	امریکا
04-11-1952	16.58	9.0	سوویت یونین (روس)
31-01-1906	15.36	8.8	ایکواڈور
04-02-1965	05.01	8.7	امریکا
15-08-1950	14.09	8.6	بھارت، چائنا بارڈر
03-02-1923	16.01	8.5	بھارت
01-02-1938	19.04	8.5	انڈونیشیا
13-10-1963	22.58	8.5	سوویت یونین

☆ دنیا میں سب سے زیادہ زلزلے جاپان میں آتے ہیں۔ یہ زلزلے اکثر معمولی نوعیت کے ہوتے ہیں۔

2005ء.....ہولناک زلزلے کی جھلکیاں

پہلا دن: آٹھ اکتوبر 2005ء بروز ہفتہ!

آج صبح آٹھ بج کر پچاس منٹ اور اڑتیس پر پاکستان کے شمالی علاقوں میں خوف ناک زلزلہ آیا۔

ریکٹر سکیل پر زلزلے کی شدت 7.6 تھی۔ پہلا جھٹکا 6 منٹ 8 سیکنڈ تک جاری رہا۔ جاپانی زلزلہ پیما شعبے کے مطابق اس زلزلے کی شدت 7.8 تھی۔ زلزلے کے چار شدید جھٹکے محسوس کئے گئے۔

اس زلزلے کو گزشتہ سو سال کے دوران آنے والا چوتھا بڑا زلزلہ قرار دیا جا رہا ہے۔

بعد میں بھی زلزلے کے ہلکے جھٹکے آتے رہے۔

بھارت میں بھی زلزلے کی لہر پہنچی۔ بھارت میں بھی بہت دیر تک زلزلے کے ہلکے ہلکے جھٹکے آتے رہے۔

لینڈ سلائیڈنگ اور پتھر گرنے سے سڑکیں بند ہو گئیں۔ کئی سڑکوں پر جگہ جگہ دراڑیں پڑ گئی ہیں۔ کئی سڑکوں پر شگاف ہو گئے ہیں۔

عمارتوں میں بھگدڑ مچ جانے سے کئی افراد زخمی، سکولوں میں بچے کچلے گئے۔

اموات ان عمارات میں زیادہ ہوئیں جہاں ہجوم زیادہ اور باہر نکلنے کا راستہ محدود تھا مثلاً بیرک، سکول، کالج اور یونیورسٹی وغیرہ۔

پاک فوج کے 200 جوان شہید، سیکڑوں زخمی، زیادہ فوجی نقصان آزاد کشمیر میں ہوا۔

بھارت میں بھارتی فوجیوں سمیت 300 افراد جاں بحق اور سیکڑوں زخمی۔

زلزلے کی لاہور فیصل آباد تک شدت تھی۔ لاہور اور اس کے گردونواح میں بھی نقصان ہوا۔

علامہ اقبال ائیر پورٹ لاہور کے تیسرے فلور پر دراڑیں۔

قدیم لاہور کے پرانے مکانوں میں دراڑیں اور ٹوٹ پھوٹ۔

وزیراعظم شوکت عزیز نے فوری طور پر ایک ارب روپے کی امداد دی۔

(جو بعدازاں تباہی کے لحاظ سے بہت محدود ثابت ہوئی)

وزیراعلیٰ پنجاب، چودھری پرویز الٰہی (جو اس وقت لندن میں تھے) نے متاثرین کیلئے 10 کروڑ روپے کی امداد فوراً دی جو بعدازاں محدود تر ثابت ہوئی۔

امدادی کاموں کے لئے ریسکیو 1122 سکواڈ روانہ کیا گیا۔

اسلام آباد میں مارگلہ ٹاور کے 84 اپارٹمنٹس گر گئے۔ درجنوں ہلاک، ناقص تعمیر کا الزام..... کیا عمارت زلزلہ پروف نہیں تھی؟ وزیراعظم اور صدر نے وہاں فوری دورہ کیا، لواحقین سے اظہار ہمدردی۔

کشمیر یونی ورسٹی تباہ۔ بھاری مالی وجانی نقصان۔

ہزارہ یونی ورسٹی کو بھی نقصان۔

زلزے کے وقت پہاڑ کٹ کٹ کر گر رہے تھے..... عینی شاہدین، سکردو۔

کوہالہ اور بکوٹ کے عینی شاہدین کے مطابق پہاڑوں سے شعلے بھی نکلتے دکھائی دیئے۔

ملک بھر میں دعاؤں کا سلسلہ شروع ہوا۔

سی ڈی اے کا ایمرجنسی ڈیپارٹمنٹ مناسب کام نہ کرسکا۔

انٹرسروسز پبلک ریلشنز کے ڈائریکٹر جنرل میجر جنرل شوکت سلطان کے بیان کے

مطابق نقصانات کا ابھی درست اندازہ نہیں لگایا جا سکتا.....البتہ فوج امدادی کاموں کے لئے روانہ۔

چوپائے اپنے بندھن زلزلے سے کچھ دیر پہلے تڑوانے لگے تھے۔ پرندے آشیاں چھوڑ گئے تھے۔زلزلے کے وقت پرندے چیختے چلاتے اور منڈلاتے رہے۔

صدر مشرف کو عالمی رہنماؤں کے تعزیتی پیغامات اور پاکستان کو امداد کی پیش کش۔

محکمہ موسمیات کے میٹریالوجسٹ انجم باری نے بتایا کہ زلزلے کے یہ جھٹکے ''شیلوارتھ کوئیک'' یعنی کم گہرائی سے آنے والے تھے۔جن کی گہرائی 10 کلومیٹر تھی اس طرح کے زلزلے بہت خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔

زلزلہ زیرزمین انڈین اور یوریشین پلیٹوں کے ٹکرانے سے پیش آیا۔زلزلے کا مرکز کوہ ہمالیہ کے سلسلے کے دامن میں آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کا وسطی علاقہ تھا۔

کچھ نہروں سے پانی اُچھل کر باہر آ گیا۔

خود ہی راستہ بدلنے اور جھٹکے لگنے پر بعض مقامات پر گاڑیاں بھی روک دی گئی تھیں۔

کئی مقامات پر ریل گاڑیاں ہنگامی بریک لگا کر روک دی گئیں۔

زلزلہ زدہ علاقے میں مواصلاتی رابطہ تقریباً منقطع۔

اصل تباہی کا اس وقت تک کسی کو پتا نہیں تھا۔ جو ملک کے شمالی علاقوں ،گلگت، بالاکوٹ، چترال، ہزارہ ڈویژن، ایبٹ آباد، مانسہرہ، سوات، باغ اور مظفر آباد میں ہوئی۔

دوسرا دن: 9 نومبر 2005ء بروز اتوار!

اب زلزلہ کی خوف ناک صورت حال سامنے آ رہی ہے۔

زلزلے کے اور جھٹکے آتے رہے ایک جھٹکا تو 5.7 شدت کا تھا۔مزید جھٹکوں کا امکان۔

زلزلہ کی ہول ناک صورت حال پر وفاقی کابینہ کا غور۔امدادی پیکج 5 ارب روپے کر دیا گیا، تین دن تک سوگ کا اعلان۔وزیراعظم شوکت عزیز نے ایمرجنسی نافذ کرنے کی تجویز مسترد کر دی۔کابینہ کے تمام ارکان کی ایک ماہ کی تنخواہ امدادی فنڈ میں دی جائے گی۔

عالمی راہ نماؤں نے صدر مشرف کو فون کئے اور دلاسہ دیا۔

ورلڈ بنک اور ایشیائی ترقیاتی بنک نے 10 ملین ڈالر کی فوری امداد کا اعلان کیا۔دیگر ممالک نے بھی امداد کا اعلان کیا.....اسرائیل نے بھی پاکستان کو امداد کی پیش کش کی۔

زلزلے میں پاک فوج کے 300 جوان شہید.....خبر ابھی مکمل ہو رہی ہے۔

خطرناک عمارات خالی کرنے کی آخری وارننگ دے دی گئی۔

متعدد سفارت کاروں کو اپنے ممالک سے ہدایات موصول ہوئیں کہ اسلام آباد سے انخلاء کے لئے تیار رہیں۔

اسلام آباد کے متعدد رہائشی مضافات میں منتقل۔

متاثرین، زخموں، امراض، سردی بھوک اور پیاس کا شکار۔

ہنوز زلزلہ زدہ علاقے میں مواصلاتی رابطہ منقطع۔

غیرملکی صحافیوں کو ائیرپورٹ پر ویزے دینے کا فیصلہ۔

گورنر سرحد خلیل الرحمان نے کہا کہ مانسہرہ، ایبٹ آباد اور بالاکوٹ میں جو عمارات زلزلے سے منہدم ہوئی ہیں، ان کی اکثریت نئی تھی۔پرانی عمارات مضبوط تھیں، بچ رہیں۔

کراچی سے فائر بریگیڈ کے ماہرین کو اسلام آباد طلب کر لیا گیا۔

مارگلہ ٹاورز اسلام آباد گرنے پر ٹھیکے دار، مالکان اور سی ڈی اے عملہ کے خلاف مقدمہ درج۔

امدادی کام ضرورت سے بہت کم پڑ گیا۔ فلاحی، مذہبی تنظیموں نے بھی آگے بڑھنے کا لائحہ عمل تیار کرلیا۔

لاہور کا عجائب خانہ عوام کے لئے عارضی طور پر بند کر دیا گیا کہ اس کی عمارت کو زلزلے سے نقصان پہنچا تھا۔

تیسرا دن: 10 اکتوبر 2005ء بروز پیر!

ہلاکتوں میں مسلسل اضافہ۔

60 لاکھ افراد بے خانماں ہونے کا اندازہ۔

حزب اختلاف نے سیاسی یوم احتجاج ملتوی کر دیا۔ تمام قومی ارکان اسمبلی اور بلوچستان اسمبلی کی طرف سے ایک ماہ کی تنخواہ کا عطیہ۔

مختلف ریلیف فنڈ قائم کر دیئے گئے۔

پاکستان نے امداد کی بھارتی پیش کش قبول کر لی۔

سرکاری کے علاوہ غیر سرکاری امدادی ٹیمیں متاثرہ علاقے کی طرف روانہ ہوگئیں۔

کچھ متاثرہ علاقوں کے زندہ افراد ابھی بھی ہر قسم کی امداد سے محروم۔

کچھ ممالک نے میڈیکل ٹیم، ہیلی کوپٹرز، طیارے، فوجی، جدید مشینری پاکستان کی مدد کے لئے روانہ کرنے کا اعلان کیا۔

مختلف اداروں اور شخصیات کی طرف سے بھاری عطیات دیئے گئے نیز زلزلہ زدگان کی فلمی اداکاراؤں نے بھی مدد کی۔

جہاں تک ممکن تھا، متاثرہ علاقے میں پی ٹی سی ایل نے مواصلاتی رابطہ تقریباً تقریباً بحال کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

چوتھا دن: 11 اکتوبر 2005ء بروز منگل!

امداد کی سرکاری و غیر سرکاری اپیل مسلسل جاری ہے۔

ہر ممکن امدادی کام کیا جا رہا ہے۔

ہر طرح کی امداد بیرون ممالک و اندرون ملک سے آ رہی ہے۔

کھانے پینے کے سامان کی سخت کمی ہے۔

بہت سے چشمے سوکھ گئے ہیں۔

دریاؤں کا پانی گدلا ہو چکا ہے جو پینے کے قابل نہیں رہا۔

تودے گرنے سے سڑکیں ٹوٹ چکی ہیں۔

کتنے لوگ جاں بحق ہوئے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا ہر شخص کے پاس علیحدہ جواب ہے۔ مرنے والوں کی گنتی ابھی نامکمل ہے۔ گاؤں کے گاؤں مٹ گئے ہیں۔ وہاں کے باشندوں کو ابھی گنتی میں شمار نہیں کیا جا رہا۔

طبی مرکز میں موجود مریضوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جن کی ہڈیاں ٹوٹ چکی ہیں۔ ان کے بازوؤں، ٹانگوں اور کندھوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ اکثر کی پسلیاں بُری طرح مجروح ہیں۔

کئی وزیر وہاں محض میڈیا کو ہی انٹرویو دینے گئے ہیں، امدادی کام پر غور نہیں کر رہے ہیں۔

کئی فریبی لوگ باہر کے علاقوں سے آ کر وہاں سے امداد کا سامان سمیٹ رہے ہیں۔

آزاد کشمیر یونیورسٹی کی عمارت کا ملبہ بھی اپنی جگہ پر موجود ہے۔ جہاں بہت سے طلباء و طالبات ملبے تلے دبے ہوئے ہیں۔

مانسہرہ شہر میں چوبیس گھنٹے کے دوران اپریشن تھیٹر تیار کیا گیا ہے۔

بالاکوٹ کو صحافیوں نے ایسا منہدم قرار دیا ہے کہ کوئی شہر کارپٹ بم باری سے بھی نہیں ہوتا ہوگا۔

تباہ شدہ عمارتوں میں اب تعفن بھی پھیل گیا ہے۔

جغرافیائی حالات ان علاقوں میں امدادی کارروائی تیز تر نہیں ہونے دیتے۔

ایک اعلیٰ افسر کے بقول فوج اور امدادی کارکنان اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ منہدم عمارت اٹھاتے وقت کسی گواہ کو ساتھ رکھیں تاکہ قیمتی اشیاء کی شہادت باقی رہے۔

ماہرین کے سامنے یہ سوال کھڑا ہے کہ شدید زلزلے سے اس علاقے میں واقع تربیلا ڈیم اور منگلا ڈیم پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ جب کہ سائنسدان اور ماہرین بڑے ڈیمز کی مخالفت کرتے ہیں۔

اس طوفانِ بلاخیز کے بعد:

آٹھ اکتوبر 2005ء کا زلزلہ معمولی نہیں تھا۔ عالمی ادارہ صحت نے بھی اعلان کیا تھا کہ اس کی تباہی سونامی سے زیادہ ہے۔

مصائب کے ایک ایسے سلسلے کا آغاز ہوا، جس کی نظیر پاکستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

زلزلے کے نتیجے میں سب سے زیادہ تباہی آزاد کشمیر میں ہوئی جہاں مظفرآباد، بالاکوٹ، باغ اور متعدد دیگر مقامات پر رہائشی علاقے، قبرستان کا منظر پیش کرنے لگے۔ کئی چھوٹے گاؤں صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔

زلزلے کے بعد جوں جوں وقت گزرتا چلا گیا۔ نقصان کا اندازہ اور گھمبیر ہوتا چلا گیا لیکن ہوا یہ کہ ہماری ساری قوم اختلافات بھلا کر ایک ہوگئی۔ عالمی سطح پر بھی اپنے پرائے

سب کام آئے۔ اسرائیل، جس سے ہمارا کوئی سفارتی تعلق نہیں، نے بھی امداد دی۔ بھارت نے لائن آف کنٹرول کے ساتھ نوفلائی زون پر پاکستان ہیلی کوپٹرز کو پرواز کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ پاکستان نے بھاری بھارتی امداد تو قبول کر لی مگر اُس کے ہیلی کوپٹرز پائلٹس کے بغیر لینا چاہے تھے مبادا وہ جاسوسی کا کارنامہ سرانجام نہ دیں۔ بھارت نے یہ طرزِعمل قبول نہیں کیا تھا۔

فنکاروں، کھلاڑیوں، طلباء، بچوں اور تاجروں الغرض ہر کسی نے نہ صرف خود امدادی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ ایسی مہمات بھی چلائیں۔ پی ٹی وی نے کراچی سے راولپنڈی تک کاروانِ محبت ٹرین چلائی جو متاثرین کے لئے امداد اور تحائف اکٹھی کرتی پہنچی۔

اس پریشان کن صورت حال کا حکومتی اداروں کے ساتھ ساتھ پاکستان کے عوام نے جس جرأت، عزم اور یک جہتی کے ساتھ سامنا کیا، وہ اپنی مثال آپ تھا۔ وہ وسائل سے محروم ہونے کے باوجود ہمت سے مالا مال تھے اور انھوں نے امدادی کارروائیوں سے لے کر سامان کی رسد تک، ہر معاملے میں پوری قوت اور محنت کے ساتھ دن رات کام کیا۔

جہاں اتحاد و یک جہتی کا عظیم مظاہرہ سامنے آیا وہاں کئی امدادی گروہ دیرینہ سیاسی عداوت کی بنا پر امدادی سرگرمیوں کے دوران الجھ بھی پڑے..... بعد ازاں قائدین کی مداخلت پر معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

سرما کی بار بار بارش سے امدادی کام سنگین اور سست ہو جاتا تھا۔ پھر اسلام آباد میں کئی بار شدید ژالہ باری بھی ہوئی۔ جو زلزلہ زدگان کے لئے بہت ہی زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوئی اور عوام استغفار میں مصروف ہو گئے۔ زخمیوں کو گرم کپڑے مہیا کئے گئے، خیمے لگائے گئے لیکن اس علاقے میں یہ سب ناکافی تھا کہ زلزلے کے بعد ہی شدید سردی اور بعد ازاں

برف باری ہو رہی تھی۔ اس لئے سردست بے خانماں افراد کے لئے ٹینٹ ویلیج بنانے کا اعلان کیا گیا تھا۔

زخمیوں اور مریضوں کو مزید بہتر علاج کے لئے لاہور بھی منتقل کیا گیا۔ غیر ممالک نے معذور افراد کی دل جوئی کی، مصنوعی اعضاء بھی مفت مہیا کئے۔

عالمی امداد اور بھائی چارہ بھی قابل رشک تھا۔ نیٹو نے بھی 10 ہزار فوجی امداد بھیجی۔ اس امداد میں دنیا کے سب سے بڑے ہیلی کوپٹرز بھی شامل تھے جو بلڈوزر تک لوڈ کر کے لے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ریڈ کراس اور اقوام متحدہ وغیرہ نے بھی ہر ممکن ساتھ دیا۔

حالات تنہا پاکستان کے بس سے باہر تھے۔ اسی لئے بین الاقوامی ارتھ کوئیک ڈونیشن کانفرنس بلائی گئی۔ اس کانفرنس میں سربراہانِ مملکت، سفیران اور وفود کو زلزلے کی خوفناک آگہی بذریعہ پرنٹ میڈیا، الیکٹرک میڈیا اور دوروں کے ذریعے دی گئی تو ساری دنیا اشک بار ہوگئی اور پاکستان کی ہر ممکن مدد کی گئی۔

پڑوسی ملک بھارت میں تمام مذاہب کے افراد نے زلزلہ زدگان کے لئے اپنے اپنے عقاید کے مطابق دعا کی۔ بھارتی شوبز کے سٹارز نے پاکستان کے لئے امدادی مہم بھی چلائی۔ وہ اسی سلسلے میں پاکستان بھی آنا چاہتے تھے مگر عملی طور پر ایسا نہ ہوا۔ البتہ فلمی اداکارہ منیشا کوئرالہ کراچی پہنچی اور اس نے چند شوز میں حصہ لیا۔ تاہم اس کی بھرپور خواہش کہ میں متاثرہ علاقوں میں جا کر امدادی سرگرمیوں میں حصہ لوں، کو حکومت نے سیکیورٹی پرابلمز کی وجہ سے رد کر دیا تھا۔

برطانیہ کی امدادی ٹیم خاص آلات لے کر آئی تھی جو ملبے میں موجود افراد کی سانسوں کے زیر و بم محسوس کرتے تھے۔ یہ آلات تسلی بخش کارگزاری نہ پیش کر سکے۔ پس تب چین

نے پاکستان کی مدد کے لیے خاص تربیت یافتہ کتے بھیجے جو عمارت کے ملبے پر کھڑے ہو کر مدفون افراد کی زندگی و موت کا اشارہ دیتے تھے۔

زخم تو جواں مرد ہی کھاتے ہیں، اس مہم میں بہت سے امدادی کارکن شہید بھی ہوئے۔ انسانیت ان کا احسان کبھی ادا نہیں کر سکتی۔

انسانی تاریخ شاہد ہے کہ متاثرہ علاقوں میں منفی سرگرمیاں بھی فوراً شروع ہو جاتی ہیں اور انسان اپنی تازہ ترین بے بسی کو بھی بھول بیٹھتا ہے۔ اکتوبر آٹھ کے بعد زلزلہ زدہ علاقے میں بھی ایسا ہی ہوا۔ نیشنل لاجسٹک سیل (NLC) نے جہاں امدادی سامان کی مفت ترسیل کی، وہاں دیگر ٹرانسپورٹرز نے بسوں، ویگنوں کا کرایہ بڑھا دیا اور حاجت مندوں سے منہ مانگا معاوضہ طلب کرنے لگے۔ کچھ علاقوں میں امدادی مہم بہت ہی دیر سے پہنچی یا مناسب مدد نہ کی گئی تو وہاں بھوک، ضرورت اور ہوس نے جرم پیدا کیا۔ کئی علاقوں میں شر پسند بھی جا گھسے اور لوٹ مار کرنے لگے، تڑاتڑ گولیاں چلنے لگیں۔ بھوکے پیاسے اور بے سایہ افراد نے بھی ہنگامے کئے اور گھروں، دکانوں سے اشیائے ضروریہ لوٹ لیں۔ اسی کے نتیجے میں قتل غارت ہوئی۔ مردہ خواتین کے زیور اتارے گئے اور بلوا ہونے لگا۔ انسانوں کے تاجر، بردہ فروش اور گندے بازار کے دلال وہاں جا کر سستے بھاؤ مال خریدنے لگے، لوگوں کو بہتر زندگی کا لالچ دینے لگے۔

جلد ہی مار دھاڑ اور انسان فروشی پر قابو پا لیا گیا۔ پھر حکومت نے وہاں کسی کو بھی بچہ گود لینے سے منع کر دیا۔ بے خانماں اور لاوارث متاثرین زلزلہ خصوصاً بچے اور جوان لڑکیاں سرکاری تحویل میں لے لی گئیں۔

شر پسند عناصر نے عوام کو تنگ کرنے کے لئے زلزلے کی پیشین گوئی کرنا اپنا وتیرہ بنا لیا۔

اس طرح کے اعلانات مساجد میں بھی کئے جاتے تھے۔شہر گاؤں، ہر جگہ یہ شر پسندی کی گئی۔ کئی مقامات پر تو باقاعدہ کاؤنٹ ڈاؤن بھی کیا گیا کہ زلزلہ آنے میں ایک گھنٹا باقی ہے، اب آدھا گھنٹا اور اب صرف دس منٹ۔مزید یقین دلانے کے لئے شر پسند کسی ٹی وی چینل کا بھی حوالہ دے دیتے تھے۔

اس مشکل گھڑی میں صدر مملکت پرویز مشرف نے جگہ جگہ طوفانی دورے کئے، امدادی سرگرمیوں کا جائزہ لیا، عوام سے ملے اور براہِ راست خطاب بھی کیا۔

وہ حسین شہر جو کبھی عالم میں انتخاب تھے، اب کھنڈر بن کر رہ گئے۔صاف پانی کی قلت ہر سُو تھی۔ بے گور و کفن لاشے متعفن ہو رہے تھے۔ بحالت مجبوری میتوں کی اجتماعی تدفین کی گئی۔وادی نیلم کی 30 فیصد آبادی ختم ہو گئی تھی۔لگتا تھا کہ یہاں کبھی شہر تھے..... بہت پہلے انسان بستے تھے۔

انسان اپنی بے بسی پر سرنگوں تھا۔

زلزلے کے ہلکے جھٹکے بہت دنوں تک آتے رہے اور عوام کے اندر زلزلے کا خوف بیٹھ گیا۔کئی زندہ بچ رہنے والے پاگل یا ذہنی مریض بن گئے۔ ماہرین نفسیات نے بھی اس سلسلے میں بھرپور کردار ادا کیا اور ایسے افراد کی دل جوئی کی۔

ہر جگہ کئی کئی ٹن وزنی ملبے کے نیچے لوگ زندہ تھے مگر انہیں نکالنے کا، بچانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ بین الاقوامی امدادی ٹیموں کی آمد کے بعد کچھ خوش نصیبوں کو باہر نکالا گیا لیکن سیکڑوں ہزاروں لوگ خوش نصیبی کے اس لمحہ کی آمد کا انتظار کرتے کرتے عدم آباد روانہ ہو گئے۔

اس علاقے کے جغرافیائی حالات سازگار بالکل نہیں تھے۔موسم کی شدت اپنی جگہ اور

پہاڑ اپنی جگہ۔کئی مقامات پر ہیلی کوپٹرز پہاڑوں کی وجہ سے نیچے نہیں اتر سکتے تھے۔سامان اوپر سے گرایا جاتا تھا۔جو کھائیوں میں گر جاتا تھا یا ضائع ہو جاتا تھا۔اسی کوشش میں چند ہیلی کوپٹرز بھی عملے سمیت تباہ ہو گئے۔

ملک میں Disaster Management کا کوئی باقاعدہ ادارہ موجود نہیں تھا۔ لے دے کے چند ریسکیو ٹیمز ہی تھیں، جن کی نفری بہت کم تھی۔ریسکیو ٹیمز کے پاس کوئی ایسی ہیوی مشینری بھی نہیں تھی کہ جس سے بھاری بھرکم ملبہ اٹھایا جاتا۔اس خوف ناک صورت حال پر اظہار تشویش کیا گیا۔ ہمارا ملک آفات سے مبرا نہیں، سیلاب تو یہاں ہر سال ہی آتا ہے۔کئی بار ہم سمندری طوفان سے دوچار ہو چکے ہیں۔متعدد بار طوفان اور بگولے سے بھی گاؤں کے گاؤں نابود ہو چکے ہیں تو پھر.....

Disaster Management کا ادارہ نہ ہونا..... چہ معنی دارد؟

ہم نے کبھی ان احتیاطی پیش بندیوں پر توجہ نہیں دی جو بڑی تباہیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ہمارے پاس نہ ضروری ساز و سامان ہے اور نہ ایمرجنسی مینجمنٹ کا کوئی ایسا نظام ہے جس کے ذریعے قومی سطح کے ایسے المیوں کے رونما ہونے کی صورت میں پریشانیوں سے نجات حاصل کی جا سکے۔

تاہم اس المیہ کے دوران یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے ایک مؤثر انفراسٹرکچر بے حد ضروری ہے جس کے ذریعے امداد کو متاثرین تک پہنچایا جا سکے، ملبے تلے دب جانے والوں کو بروقت نکالا جا سکے، زخمیوں کا فوری علاج کیا جا سکے اور مصائب سے دوچار ہو جانے والوں کو امداد کا سائبان فراہم کیا جا سکے۔

بہرحال اس موقع پر پاکستانی فوج نے نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔جوانوں کی

وردیاں گل گئیں، ہاتھ شل ہو گئے مگر وہ دُھن کے پکے کام کرتے رہے۔اسی شان دار نظم و ضبط کا مظاہرہ پاک فوج ہر مصیبت میں کرتی آئی ہے اور ملک و ملت اس پر نازاں ہے۔

حکومت نے فوج اور سوشل ورکرز کی مدد سے مالی امداد کا عمل ٹرانسپیرنٹ بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔اور یہ کوشش کامیاب بھی رہی ہے۔

یہ بحالی زلزلہ زدگان ابھی تشنہ کام ہے۔زلزلہ زدہ علاقے میں ہنوز تعمیر و ترقی جاری ہے۔تعلیم،طب، رہائش اور دیگر ضروریاتِ زندگی مہیا کی جارہی ہیں۔

گلاس کیبنز، ٹینٹ وِلیج، میٹل ہاؤس سسٹم اور دیگر تعمیراتی سلسلے بھرپور انداز میں جاری وساری ہیں۔

ہر ذی ہوش زلزلہ زدگان کے لئے دعا گو ہے اور ہر ممکن مدد کے لئے مستعد بھی۔ مالک الملک ان پر رحم فرمائے، انھیں صبر جمیل عطا کرے اور مرحومین کو غریقِ رحمت کرے۔

②❶❶⑦